قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

اللہ

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ دارین

گوجرانوالہ

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

ماہنامہ
آدمیت فلاح
گوجرانوالہ
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 8 شمارہ 4 جولائی 2006ء جمادی الثانی 1427ھ

ایڈیٹر وحید احمد

قیمت ——— 20/- روپے   سالانہ فنڈ ——— 200/- روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

"درس قرآن"

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰؒ)

دنیا کی ظاہری شان وشوکت ایک دھوکہ ہے

پھر نبی اکرم ﷺ کو خطاب کر کے یوں بیان فرمایا:

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ ؕ
مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ثُمَّ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ط وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ؕ
لٰـكِنِ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ
خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ط وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ؕ

"(اے نبی ﷺ!) دنیا کے دوسرے ممالک میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت اور (شان وشوکت) تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سے لطف ہے اس کے بعد یہ سب لوگ جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے رب کریم سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے (شیریں) نہریں بہتی ہیں۔ اُن باغوں میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور (اُن لوگوں کے لئے) اللہ کی طرف سے یہ سامانِ ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ نیک لوگوں کے لئے سب سے بہتر ہے۔" (آل عمران: 196-198)

اس آیت سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی ظاہری شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ ہی سب کچھ نہیں اور نہ ہی یہ معیارِ حق ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ آخر کار غلبہ اسلام ہی کو حاصل ہوگا۔ اسلام حکومت بھی دیتا ہے، دولت وثروت بھی اور امن وامان بھی۔ اسلام کی بدولت یہ تینوں چیزیں ملتی ہیں لیکن اگر عارضی طور پر ایک سمگلر، چور، اچکا، ڈاکو یا دہشت گرد غالب آجاتا ہے اور دادِ عیش دے لیتا ہے تو یہ مستقل شے نہیں۔ کوئی سادہ لوح شخص اگر کسی سمگلر یا ڈاکو کی شان وشوکت سے مرعوب ہو کر یہ سمجھ بیٹھے کہ زندگی گزارنے کا یہی طریقہ ہے یا پھر کسی ہیروئن فروش کے خوبصورت محل کو دیکھ کر یہ تصور کرلے کہ یہی آدمی خوش نصیب ہے تو یہ احساس یا یہ تصور یقیناً احمقانہ ہے اور گمراہ کُن ہے۔ اس لئے کہ ایسے شخص کا نصیب یا خوش قسمتی اُسی وقت تک قائم ہے جب تک کہ قانون کے ہاتھ اُس کی گردن تک نہیں پہنچتے۔ جونہی پولیس کا شکنجہ اُس کی گردن تک پہنچے گا، اُس کی خوش نصیبی اور شان وشوکت سب کی سب دھری رہ جائے گی۔ یہاں "مجرمین" سے مراد افراد بھی ہیں اور

معاشرے بھی۔ان کی چلت پھرت اور شان وشوکت محض چندروزہ ہے۔

صبر، ربط اور تقویٰ

آگے چل کر سورۂ آل عمران کا اختتام جس آیت کریمہ پر ہوتا ہے، وہ بہت ہی عظیم الشان ہے آیت کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! (باطل پرستوں کے مقابلے میں) صبر سے کام لو اور پامردی دکھاؤ۔(حق کی خدمت کے لئے) کمر بستہ رہو اور تقویٰ اختیار کرو۔اُمید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔'' (آل عمران:200)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو تین باتوں کا حکم دیتے ہیں۔(1) صبر اور مصابرت کرو (2) رباط و مرابطت کرو (3) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

صبر اور مصابرت: اس کے لفظی معنی باندھنے کے ہیں۔صبر تین قسم کا ہوتا ہے (الف) اللہ کی اطاعت میں صبر کرنا (ب) اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے اپنے آپ کو روکے رکھنا (ج) مصیبت اور تکلیف میں صبر کرنا اور مطمئن ہو جانا اس کے بعد مصابرت کا ذکر ہے۔اس کے معانی ایک دوسرے کو صبر کو دینا۔دشمن کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جانا ہے۔دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ وہ بھی صبر کرنے کا مزہ چکھے۔

رباط و مرابطت

رباط کے دو مفہوم ہیں: ایک مفہوم تو سرحدوں کی حفاظت ہے۔جنگ کے دوران میں تمام چوکیوں کا آپس میں رابطہ اور پھر اُن کے باہمی رابطے سے سرحد کا ایک ایک انچ محفوظ ہو جانا، اس کو مرابطت کہتے ہیں۔رباط کے ایک دوسرے معنی نماز باجماعت کی حفاظت کرنا ہے۔ایک نماز ہوئی، پڑھ کر واپس آئے، آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن واپس آ گئے۔اس طرح کہ۔

داغِ وا رفتہ کو ہم رات ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسجد سے نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا لیکن یہ دنیا اُسی کی بنائی ہوئی ہے۔اسباب کی دنیا ہے، اس لئے اِس میں واپس آنا پڑتا ہے۔اب یہ ہوتا ہے کہ ایک نماز پڑھ لی لیکن اس کا نشہ کچھ ایسا چڑھا کہ دوسری نماز کے انتظار میں لگ گئے۔وہ بھی پڑھ لی تو اگلی نماز

کا انتظار ہے۔نمازوں کا جو باہمی رابطہ پیدا ہوا، اس کو بھی رباط کہتے ہیں۔اس سے بھی انسان کی شخصیت کی حفاظت یوں ہوتی ہے جیسا کہ فوجی چوکیاں سرحد کی حفاظت کرتی ہیں۔

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو

تقویٰ ڈرنے اور بچنے کے معنی میں ہوتا ہے لیکن ڈرنا اس معنی میں نہیں جیسے کوئی سانپ، بچھو، بھیڑیئے یا شیر سے ڈرتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی کیفیت یوں ہوتی ہے جیسے کوئی اپنے محسن ومحبوب کی ناراضگی سے ڈرے کہ کہیں اس کی نگاہِ محبت سے گر نہ جائے۔ یہ تقویٰ ہوتا ہے اور یہ ڈر بہت کڑا ڈر ہوتا ہے کہ میں تو اس کا ہوں اور وہ میرا ہے۔میری اس کے ساتھ ایک نسبت ہے، حاضری ہے، حضوری ہے۔اس سے تعلق ومحبت میں کہیں کمی واقع نہ ہو جائے۔اسے تقویٰ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو اس صبر ومصابرت، رباط ومرابطت اور تقویٰ ایسے اخلاقِ حسنہ سے متصف ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین

النساء

نام

اس سورۃ میں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے خصوصی احکام ذکر کیے گئے ہیں۔اس وجہ سے اس کا نام ''النساء'' رکھا گیا ہے۔

زمانہ نزول

یہ مدنی سورۃ ہے۔اگر تاریخی اعتبار سے اس سورۃ کے مضامین اور ہجرت کے بعد کے حالات کا تجزیہ کیا جائے تو اس سورۃ کے نزول کا زمانہ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔یہ غالباً 4-5 ہجری کا زمانہ ہے۔

شانِ نزول اور مضامین

یہ سورۃ بھی اپنی ہمہ گیریت کے اعتبار سے مختلف مضامین کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ان مضامین کی ایک جھلک اور شانِ نزول درج ذیل ہے:

مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد مدینہ میں جس معاشرہ کی بنیاد رکھی گئی، اس معاشرہ کی تربیت اور اخلاقی قدروں کے تحفظ کیلئے احکام کا ایک حصہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے۔اب معاشرہ عمرانی اعتبار سے مزید احکام کا متقاضی تھا۔اس لئے اس سورۃ میں مزید احکام کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ کے آغاز میں عائلی قوانین کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ہے کیونکہ جنگ اُحد کے دوران میں شہید ہونے والوں کے پسماندگان کیلئے نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً بیواؤں، یتیموں اور بیویوں کے حقوق، تقسیم، میراث وغیرہ۔ اسی طرح عام عائلی زندگی میں اگر زوجین کسی مسئلے پر اختلاف کا شکار ہو جائیں اور یہ اختلاف شدت اختیار کر جائیں تو اُن کے حل کیلئے ہدایات بھی اس سورۃ میں ذکر کی گئیں۔ اسی طرح سورۃ کے اختتام سے کچھ پہلے ان احکام کو بطور تتمہ ذکر کیا گیا۔ مختصراً ایک امن پسند اور صالح معاشرے کیلئے جو باتیں ضروری ہیں، وہ اس سورۃ میں مذکور ہیں۔

خانگی معاملات و مسائل کے ذکر اور ان کے حل کے بعد معاشرتی اور حکومتی مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی۔ مثلاً شراب کی حرمت، قتل عمد اور قتل خطا کیلئے تعزیری قوانین وغیرہ۔

جنگ اُحد میں جب مسلمانوں کی فتح کے آثار نمایاں ہو گئے تو بعض صحابہؓ نے گھاٹی کو قبل از وقت چھوڑ دیا جس کے باعث مسلمانوں کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس وجہ سے کفار مکہ اور مدینہ کے گرد و پیش میں بسنے والے یہودیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ مسلمانوں کو پریشان کرنے کیلئے بلکہ مٹانے کیلئے ہر روز نئے پروگرام بناتے۔ ان سازشیوں کی سرکوبی کیلئے نبی اکرم ﷺ نے غزوات بھی کئے اور صحابہ کرامؓ کی مہمات بھی روانہ کیں۔ اس دوران میں مجاہدوں کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں بھی ہدایات اس سورۃ میں مذکور ہیں مثلاً:

(الف) منافقین اور ضعیف العقتاد لوگ بدحواسی پھیلانے والی خبروں کو پھیلاتے جس کے باعث مجاہدوں کے حوصلے پست ہوتے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ جب بھی کوئی ایسی خبر علم میں آئے تو اس کو ذمہ دار حضرات کے نوٹس میں لا کر اس کی تحقیق و تفتیش کرائی جائے۔

(ب) اسی طرح غزوات و سرایا اور عام سفر کے دوران میں متعدد بار ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی کہ پانی کمیاب بلکہ نایاب ہو جاتا۔ جس کے باعث وضو اور غسل ناممکن ہوتا۔ ایسی حالت میں غسل اور وضو کے متبادل کے طور پر تیمم کا حکم نازل ہوا۔ غالباً یہ حکم غزوہ بنی مصطلق 5 ہجری سے متصل زمانے کا ہے۔ اسی طرح جنگ کے دوران میں جب گھمسان کا رن ہوا، اس کے لئے صلوٰۃ الخوف کا طریقہ بتایا گیا۔ عمومی سفر کے دوران میں نماز قصر کے احکام کا ذکر ہے اور یہ غزوہ ذات الرقاع یعنی 4 ہجری کے دور کا واقعہ ہے۔

(ج) اس سورۃ میں دار الحرب میں بسنے والے مسلمانوں کو ہجرت کیلئے ترغیب دلائی گئی اور ہجرت کے فضائل و برکات بیان ہوئے۔ کمزور و ضعیف مسلمانوں کی امداد و اعانت اور اُن کو

Scanned with CamScanner

مظلومیت کی زندگی سے نجات دلانے کیلئے آزاد مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا گیا۔

(د) اس سورۃ میں منافقوں کے مختلف طبقات، اُن کی شرارتوں، بدعہدیوں اور سازشوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا۔ اُن کے کردار پر سخت گرفت کی گئی۔ یہ دور وہی ہے جس دور میں مدینے سے یہودی قبیلے کا اخراج ہوا۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے باطل اور من گھڑت اعتقادات و نظریات کی بھی تردید کی گئی کہ وہ ان گمراہیوں سے بچیں اور اپنے پیشروؤں کے حالات سے عبرت حاصل کریں۔ آخر میں دعوت و تبلیغ کے اسلوب اور طریقہ کار کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ اس راستے کے مصائب و مشکلات کو صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس سورۃ کی ابتداء تقویٰ کی ہدایت سے ہوتی ہے۔ کیونکہ تقویٰ احکام الٰہی پر عمل پیرا ہونے کے لئے پہلا زینہ ہے۔ جس پر انسانیت کی فوز و فلاح کا دارومدار ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

یَاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ۝

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑ ابنایا اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتے باندھتے ہو۔ رشتہ اور قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔"

(النساء:1)

اللہ تعالیٰ کا نام جب دو نامحرموں کے درمیان آتا ہے تو وہ محرم بن جاتے ہیں اور اتنا مضبوط اور قریبی رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ قریبی رشتہ تصور میں نہیں لایا جا سکتا۔ اب فرمایا کہ اس اللہ تعالیٰ کے نام کی لاج رکھنا، اُس کی شرم رکھنا، اگر اللہ کے نام پر رشتہ قائم کیا ہے تو اُسے نبھائے رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ اِدھر اللہ کا نام لیا، اُدھر جفا کرنے لگے۔ یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ اسی طرح آگے چل کر فرمایا کہ یتیموں کے ساتھ بے انصافی سے ڈرتے رہو۔

یتیموں کے حقوق

سورۃ النساء کے آغاز میں عورتوں کے علاوہ یتیموں کے حقوق کے متعلق بھی تفصیلی طور پر احکامات آئے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ص وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا o

''یتیموں کے مال اُن کے حوالے کرو۔ نہ اپنے برے مال کو اُن کے اچھے مال سے بدلو اور نہ اُن کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کر کے اُس کو ہڑپ کرو۔ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

(النساء:2)

مال و دولت کے لالچ میں لوگ یتیم بچوں اور خصوصاً یتیم رشتہ داروں کا مال ہڑپ کر جاتے یا اس میں خورد برد کرتے۔ ایسے لوگ بظاہر تو یتیموں کی ہمدردی کرتے اور اُن کے لئے کام کرتے نظر آتے ہیں لیکن دراصل کاروبار کے انتظامی امور کے بہانے سے یہ لوگ یتیموں کا مال اپنے مال میں ملا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو منع فرمایا گیا ہے کہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ گڈمڈ کر کے ہڑپ کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ یتیموں کا مال اُن کے حوالہ کر دو۔ بعدازاں اس کی تفصیل بھی آ گئی کہ جب یتیم بالغ ہو جائے تو اُس کا مال اُسے دے دو اور یہ دیکھنے کے لئے کہ یتیم عقلی طور پر کس حد تک بالغ ہو چکے ہیں اُسے کچھ کاروباری ذمہ داری میں شریک کرو۔ اور خاص طور پر یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کے بارے میں خصوصی احتیاط کا حکم دیا گیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ج فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

''اگر یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار کے ساتھ نکاح کر لو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو۔'' (النساء:3)

بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک

سعودی عرب میں ہمارا ایک ہمسایہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں

کرتا۔ ایک دفعہ مجھے مسجد میں ملا اور کہنے لگا "کیا میں دوسری شادی کرلوں۔ میرے لئے جائز ہے؟" میں نے کہا نہیں! کہنے لگا کیوں؟ قرآن میں تو اجازت ہے۔ میں نے کہا تمہارے لئے نہیں۔ قرآن کی رو سے تو تم ایک بیوی کے بھی مستحق نہیں ہو، کیونکہ تم ایک کے ساتھ بھی عدل نہیں کرتے۔

تعدد ازواج کی مصلحت اور حکمت

دراصل یہ دو دو، تین تین اور چار چار شادیوں کا معاملہ اتنا آسان مسئلہ نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے بہت سی شرائط لگا رکھی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک سے زیادہ کے ساتھ نکاح کرنے کو کہا جا رہا ہے تو یہ دراصل شادیوں کی تعداد کو محدود کیا جا رہا ہے۔ لوگوں نے غلط سمجھا کہ اسلام نے ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ایک سے زائد شادیوں کی اجازت تو اسلام سے قبل بھی موجود تھی، لوگوں کے پاس تو تیس تیس، چالیس چالیس عورتیں ہوتی تھیں۔ اسلام نے تو پابندی لگا کر اس کو چار تک محدود کر دیا۔ ایک صحابی تھے غیلان بن اسلم ثقفی۔ قبول اسلام کے وقت ان کی دس بیویاں تھیں۔ آپ نے کہا کہ بھئی چار سے تو زیادہ رکھنے کی گنجائش نہیں۔ انہیں چھ بیویوں کو طلاق دینا پڑی۔ اسلام نے تو زائد تعداد کو محدود کیا اور اس محدود تعداد کے لئے بھی شرائط عائد کر دیں۔ ایسی شرائط جو نناوے فیصد لوگ پوری نہیں کر پاتے۔ اس لئے ان کے لئے ایک سے زائد کی گنجائش نہیں بنتی۔

حضور اکرمؐ کی شادیوں کی مصلحتیں

راقم ایک بار امریکہ گیا۔ وہاں بھی یہ سوال کیا گیا کہ حضورؐ کی اتنی زیادہ بیویاں کیوں تھیں؟ عرض کیا کہ آپ نے صرف اتنا ہی سوچا ہے، کبھی اس سے آگے بھی غور کیا کہ یہ شادیاں کیوں اور کن حالات میں ہوئیں؟ اور ان کا کیا فائدہ ہوا؟ حضورؐ کی پہلی شادی کب ہوئی اور کب تک نبھایا؟ ان سب باتوں کا جواب اُنہیں معلوم نہیں تھا۔

حضورﷺ نے 25 برس کی عمر میں سیدہ خدیجۃ الکبریٰ سے شادی کی جب کہ اُس وقت اُن کی عمر 40 برس تھی۔ حضور اکرمؐ نے اُن کے ساتھ ان کی زندگی تک نباہ کی یعنی پچاس سال کی عُمر تک آپؐ نے پینسٹھ سالہ معمر خاتون سے نباہ کیا اور دوسری شادی نہ کی۔ اُن کی وفات کے بعد آپؐ نے سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی جو عمر میں آپ سے تقریباً پانچ برس بڑی تھیں۔

چار سال اُن کے ساتھ بھی اکیلے نباہ کیا۔ چون سال کے بعد صرف ایک خاتون سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایسی خاتون ہیں جو کنواری تھیں اور آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ بقیہ سب خواتین عمر اور زیادہ تر بیوگان تھیں۔ شادیوں کے فوائد کیا ہوئے؟ غور کیجیے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ابوسفیان کی بیٹی رملہ بنت ابی سفیان سپہ سالار قریش کی حیثیت سے جنگ اُحد سے لے کر قبول اسلام تک مسلسل حملہ آور ہوتے رہے۔ اس شادی کے بعد قریش کے سارے حملے ختم ہو گئے۔ اُدھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہود نے مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا۔ مختلف قبیلوں نے سازشوں کے جال پھیلا رکھے تھے۔ لیکن جیسے ہی بنو قریظہ کے یہودی سردار کی بیٹی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے حضور کی شادی ہوئی تو یہ سازشیں دم توڑ گئیں۔ حضورؐ نے ستر **حفاظ اور قُرآء** نجد میں بھیجے۔ نجد کے لوگوں نے سب کو شہید کر دیا۔ آپ نے نجد کے سردار کی بہن سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کر لی۔ اس شادی کے بعد نجد کی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔

یہ ہیں وہ معلومات جن سے ہم محروم چلے آ رہے ہیں۔ ہم واقعات کی چھان بین نہیں کرتے۔ اُن کے اسباب سے واقف نہیں ہوتے اور اُن کے نتائج و فوائد پر غور نہیں کرتے جن کا جاننا ہم پر فرض ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی اُن تمام شادیوں کی تفصیل راقم کی کتاب ''خطبات حرم'' میں موجود ہے جو لوگ تفصیلاً جاننا چاہیں، وہ اس کتاب سے استفادہ کر لیں۔

مالِ یتیم کی واپسی

اسی طرح یتیم بچوں کے بالغ ہونے اور اُن کی عقل و دانش کو پرکھنے کے بعد اُن کی دولت اُن کے حوالے کرنے کو کہا وہ اس کو ضائع نہ کر دیں۔

ارشاد ربانی ہے:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ

''ان یتیموں کو جانچتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم اُن کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ تو اُن کا مال اُن کے حوالے کر دو۔'' (النساء:6)

یعنی یتیموں کو چھوٹی موٹی ذمہ داری دے کر اُن کو جانچتے رہو کہ ان میں کتنی صلاحیتیں اور

سوجھ بوجھ موجود ہے اور جب وہ اس قابل ہو جائیں کہ ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھا سکیں تو اُن کا مال اُن کے سپرد کر دو اور یاد رکھو! اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

یتیموں کا مال کھانے کا وبال

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَسَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ﴿۱۰﴾

''جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں۔ وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔'' (النساء:10)

احکام الٰہی کی پابندی

اس کے ساتھ ہی وراثت کے تفصیلی احکام کا ذکر ہے تا کہ خاندان کے سبھی افراد مرد وعورت، چھوٹے اور بڑے کے حصص متعین کئے جائیں اور جھگڑے کے امکانات ختم ہو جائیں اور اس ساری تفصیل کے بعد شریعت کے بارے میں دونوں گروہوں (فرماں بردار اور نافرمان) کے انجام کو یوں ذکر فرمایا:

تلك حدود الله ؕ ومن يطع الله و رسوله يد خله جنت تجری من تحتها الانهر خلدين فيها ؕ و ذلك الفوز العظيم ﴿﴾ ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدود ہ يد خله نارًا خالدًا فيها ص وله عذاب مهين ﴿﴾

''یہ (تمام احکام) اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا۔ اللہ اُس کو جنت میں داخل کرے گا جس میں نہریں بہ رہی ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اُس کی حدوں سے نکل جائے گا، اس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ذلت کا عذاب ہوگا۔'' (النساء13-14)

توبہ اور شرائط توبہ

رحیم وکریم ذات نے اپنے بندوں کی خطاؤں کو معاف کرنے کیلئے رحمت کا اعلان عام کر رکھا

ہے۔ کیونکہ بندوں کا دشمن ابلیس ان کو ہمیشہ راہِ حق سے بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے خالق سے دور کرنے کی ہر راہ مزین کرتا ہے تاکہ آدم کی اولاد سے انتقام لے سکے لیکن رحیم خالق نے اپنے بندوں کے خلاف اس دشمن کے سارے منصوبے ایک توبہ کے ذریعے ناکام بنانے کا اعلان فرمادیا۔ توبہ کی شرائط درج ذیل آیات میں یوں ذکر کی گئیں:

انما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فاولٰئك يتوب الله عليهم ط وكان الله عليما حكيماo وليست التوبة للذين يعملون السيات ج حتى اذا حضر احدهم الموت قال انى تبت الئن ولا الذين يموتون وهم كفار ط اولٰئك اعتدنا لهم عذاباً عليماًo

''اللہ تعالیٰ اُنہی لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ جو نادانی سے بری حرکت کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں پر اللہ مہربانی کرتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے (اور) حکمت والا ہے اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) برے کام کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آموجود ہو تو اُس وقت کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن کی (توبہ قبول ہوتی ہے) جو کفر کی حالت میں مریں۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (النساء: 17-18)

نکاح کا مقصد

بیویوں کے حقوق کے سلسلہ میں مہر کی ادائیگی کا قطعی حکم دے کر اُن عورتوں کی تفصیل کا ذکر کیا گیا جن کے ساتھ از روئے شرح نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ اِس مقام پر غور کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شریعت کی رو سے مقصد نکاح کیا ہے؟ نسل آدم کا بقا، پاکدامنی، عفت و عصمت کی حفاظت، بدکاری و بے حیائی کا انسداد اور مرد و عورت کے خفیہ اور ناپسندیدہ تعلقات کی بیخ کنی۔

اسلام میں امانت کی اهمیت

امتیاز احمد (لندن)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔سورۃ النساء:58

ان اللّٰہ یامرکم ان تئودوا ا لامنت الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعاً بصیرا ہ

(ترجمہ) خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انکے حوالے کردیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک خدا سنتا اور دیکھتا ہے۔

اس آیت کا شان نزول بہت دلچسپ ہے۔

فتح مکہ سے پہلے خانہ کعبہ کی چابیاں حضرت عثمان بن طلحہ کی تحویل میں رہتی تھیں۔فتح مکہ کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے عثمان بن طلحہ سے خانہ کعبہ کی چابیاں طلب فرمائیں۔عثمان بن طلحہ نے قدرے پس و پیش کے ساتھ یہ کہکر چابیاں حضور ﷺ کے حوالے کیں کہ میں یہ چابیاں آپ کو بطورِ امانت دے رہا ہوں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولا اور اندر سے تمام بتوں کو نکال کر نیست و نابود کردیا۔حضرت عمرؓ کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ جب کعبۃ اللہ سے باہر تشریف لائے تو آپ نے سورۃ النساء کی آیت نمبر 58 کی تلاوت فرمائی۔

اب آپ نے چابیاں دوبارہ حضرت عثمان بن طلحہ کو واپس کرنا چاہیں تو حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر حضور کو چابیاں لوٹانے سے روکنا چاہا اور کہا کہ آج سے یہ چابیاں عباسؓ حضرت علیؓ کی تحویل میں رکھیں۔اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی یہ بات رد کرتے ہوئے فرمایا یہ چابیاں مجھے امانت کے طور پر دی گئیں تھیں۔اور امانت میں خیانت کرنا اسلامی قانون کے خلاف ہے۔حضرت عثمان بن طلحہ نے خوشی خوشی چابیاں واپس لے لیں اور آپ ﷺ کے بلند کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرلیا۔

اس بات کو خاص طور سے نوٹ کیا جانا چاہئے کہ حضور ﷺ نے خانہ کعبہ کی جو چابی حضرت

عثمان بن طلحہؓ کو مرحمت فرمائی، اس کی مالی اعتبار سے کوئی قیمت نہیں تھی کیونکہ وہ محض ایک پرانی دھات کا ٹکڑا تھا۔ دراصل خانہ کعبہ کی خدمت گذاری حاصل ہونا ایک قابل احترام بات تھی اس لئے امانت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اجتماعی اہم فرض کی ذمہ داری کس کو سونپ رہے ہیں۔ اس لئے کسی کو ایک اہم ذمہ داری سونپنا ہی امانت ہے۔

حضرت انسؓ نے فرمایا کہ حضورﷺ کا دیا ہوا کوئی خطبہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں یہ تذکرہ نہ ہو کہ جو امانت میں خیانت کرتا ہے اُس کا دل ایمان سے خالی ہے۔ اور جو کسی عہد کو توڑتا ہوا اسلامی زندگی کا ذرا برابر بھی شعور نہیں ہے۔ (بیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ کا فرمان ہے کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔ (مسلم و بخاری)

اللہ تعالیٰ نے جنت میں داخل ہونے کی چند شرائط سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج میں بیان فرمائی ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ سورۃ المعارج **32 تا 35**

والذین هم لامنتهم و عهدهم رعون ٥والذین هم بشهدتهم قائمون ٥والذین هم علی صلاتهم یحافظون ٥اولئك فی جنت مكرمون٥

(ترجمہ) اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں، اور جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں، یہی لوگ بہشت میں عزت و کرام سے ہونگے۔

پس وعدوں کا پورا کرنا بالکل ایسا ہی اہم ہے جیسے نماز کا صحیح طریقہ سے ادا کرنا۔ حضورﷺ نے مزید فرمایا **(المجالس فی الامانة)** یعنی ہر مجلس کی کاروائی ایک امانت ہے۔ مجلس کی باتوں کو مجلس سے باہر کے لوگوں پر ظاہر نہ کیا جائے۔

اسی طرح حضورﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص سے جو بھی مشورہ کیا جائے تو وہ اسے نہایت ایمانداری سے دے۔ **(المشار موتمن)** اور راز کو فاش نہ کرے ورنہ امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگا۔

آیئے ہم دیکھیں صحابہ کرامؓ ان حالات میں کیا کیا کرتے تھے۔ یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ صحابہ کرامؓ بھی ہماری ہی طرح انسان تھے۔ اور ان سے بھی عام انسانوں کی طرح غلطیاں سرزد ہو سکتی

تھیں۔اسی لئے اللہ تعالیٰ سورۃ الانفال میں ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔سورۃ الانفال: 27

یایھا الذین ء امنو الا تخونوا اللہ والرسول وتخونو ا امنتکم وانتم تعلمون

(ترجمہ) اے ایمان والوں! نہ تو خدا اور رسول ﷺ کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم (ان باتوں کو) جانتے ہو۔

یہ آیت کریمہ ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔جب حضور ﷺ کی فوجوں نے بنو قریظہ کے قبیلے کو مدینہ کے پاس محاصرے میں لے لیا۔یہ محاصرہ قریب ۲۱ دنوں تک اس یہودی قبیلے کے اوپر مسلط رہا۔بالآخر ابولبابہ کو ثالث مقرر کیا گیا۔جب ابولبابہؓ اس یہودی قبیلے کے پاس پہنچے تو ان لوگوں نے ابولبابہؓ سے پوچھا کہ اگر ہم محاصرہ توڑ کر قلعہ کے باہر آنے کی کوشش کریں تو ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ ابولبابہؓ نے انگلی اپنے گلے پر پھیرتے ہوئے کہا کہ تمہاری گردنیں اڑادی جائیں گی۔دراصل یہ بات حضور ﷺ اور ابولبابہؓ کے درمیان ایک راز کی بات تھی۔جیسے ہی ابولبابہؓ یہودی قبیلے سے مل کر واپس آئے تو انہیں اپنی غلطی کا بری طرح احساس ہوا۔اور نتیجہ کے طور پر انہوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی میں ایک ستون سے باندھ لیا۔یہ سلسلہ سات دن اور سات راتوں تک جاری رہا۔انہوں نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت تک آزاد نہیں کریں گے جب تک ان کی توبہ قبول نہ ہو جائے۔جب حضور ﷺ کو اس بارے میں معلوم ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ابولبابہؓ سیدھے میرے پاس آجاتے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ اللہ ان کی غلطی معاف فرمادے۔اب میں یہ معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔اُنہیں چاہئے کہ اس وقت کا انتظار کریں جب تک ان کے احساس ندامت کو اللہ تعالیٰ خود قبول نہ کرلیں۔

سات دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابولبابہؓ کی غلطی کو معاف فرمادیا۔اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک وعدہ خلافی اور راز کو افشاء کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا جس کے سرزد ہونے پر حضرت ابی لبابہؓ نے خود اپنے آپ کو ایسی شدید اور تکلیف دہ سزادی۔

ہم آج بھی مسجد نبوی کے اندر روضۃ من ریاض الجنۃ میں یہ ستون دیکھ سکتے ہیں جو ستون ابی لبابہؓ کے نام سے موسوم ہے۔یہ ستون ٹھیک اس پیڑ کی جگہ بنا ہوا ہے جس پیڑ سے ابولبابہؓ نے

اپنے آپ کو باندھ لیا تھا۔ بہت سے افراد (حاجی صاحبان) اس ستون کے قریب جا کر نفل ادا کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت کیلئے دعائیں کرتے ہیں۔

اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی بھی حکومت یا ادارے کی اہم ذمہ داریوں کو امانت کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی حاکم اپنے کسی دوست یا رشتے دار کو ایسی ذمہ داری دیتا ہے جس کا وہ اہل نہیں ہے تو ایسے حکمران پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ ایسے لوگوں کی عبادت قبول نہ ہوگی اور وہ جہنم کی آگ کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ (جمع الفوائد)

بخاری شریف میں درج ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ

جب آپ یہ دیکھیں کہ اہم ذمہ داریوں کے عہدے ایسے نا اہل لوگوں کو دئے گئے ہوں جو اس کے اہل اور قابل نہیں ہیں تو (اس فساد کا کوئی علاج نہیں) آپ کو یوم حساب کا انتظار کرنا چاہئے۔

علاوہ ازیں امانت ایک بڑی ذمہ داری ہے جسے مکمل دیانت اور خلوص سے ادا کیا جانا چاہئے امانت میں خیانت کرنے کے نہایت سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔

مثال کے طور پر ایک دن حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں کوئی اہم ذمہ داری کا عہدہ عطا کیا جائے، حضور ﷺ نے فرمایا:

یا ابا ذر انك ضعیف وانھا امانۃ وانھا یوم القیامۃ خزی وندامۃ الا من اخذ بحقھا وادی الذی علیہ فیھا (مسلم)

(ترجمہ) اے ابوذرؓ تم ضعیف آدمی ہو اور اہم منصب اللہ کی امانت ہے جو لوگ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے وہ قیامت کے دن ذلیل و خوار ہوں گے سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا ادا کر دیا۔

آیئے ہم سورۃ النساء کی آیت نمبر 58 پر مزید غور و خوض کریں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ یوں فرماتا ہے کہ تم جب وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو فیصلہ انصاف کے ساتھ کرو"۔ یہ حکم صرف وزراء اور حکام پر ہی لاگو نہیں ہوتا بلکہ عام انسانوں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے بین المسلمین یا بین المومنین نہیں کہا بلکہ بین الناس کہا۔ اس کا

مطلب یہ ہوا کہ تمام لوگوں کو برابر انصاف ملنا چاہئے۔ خواہ وہ دوست ہوں، یا دشمن، مسلم ہوں یا غیر مسلم، چاہے ہموطن ہوں یا اجنبی، سب کو برابر کا انصاف ملنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ان مساوی بین الاقوامی حقوق العباد کی تلقین فرماتے ہیں۔ جبکہ دوسرے مذاہب کے بین الاقوامی حقوق کا پرچار بودا اور محض دکھلاوا ہے۔

یہ بھی قابل غور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے امانت کا ذکر کیا اس کے بعد انصاف کی بات کی۔ شاید یہ اس لئے ہے کہ انصاف اس وقت تک قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک اہم ذمہ داریاں قابل اور اہل لوگوں کے سپرد نہ کی جائیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو آج کل حکومتوں اور دوسرے اداروں میں پائی جاتیں جن میں مساجد اور اسلامی ادارے بھی شامل ہیں۔ جب تک صحیح عہدے صحیح لوگوں میں تقسیم نہیں کئے جائیں گے اُس وقت تک کسی بھی ادارے کے مسائل صحیح طور پر حل نہیں کئے جاسکتے۔

قرآن حکیم اس بات کو بھی رد کرتا ہے کہ کسی حکومت میں عہدے لوگوں کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کئے جائیں۔ یہ عہدے اُن کا ذاتی حق نہیں ہے۔ یہ عہدے تو اللہ کی امانت ہیں اور صرف باصلاحیت لوگوں کو ہی دیئے جانے چاہئیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلاحتیں پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے۔؟

قرآن پاک میں درج مندرجہ ذیل قصہ اس بارے میں ہماری رہنمائی کرے گا ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو کمسن لڑکیوں کو کنویں کے پاس اپنے جانوروں کے ساتھ دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سارے لوگ اپنے جانوروں کے لئے کنویں سے پانی نکالتے ہیں اور اُن کے جانور پانی پی کر واپس چلے جاتے ہیں، ان لڑکیوں نے اپنے جانوروں کو بڑی دیر تک کنویں سے دور رکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آخر کار لڑکیوں سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ لڑکیوں نے جواب دیا: ہمارے والد صاحب بہت بوڑھے ہیں ہم کنویں سے پانی نہیں کھینچ سکتیں۔ ہم کنویں پر اُس وقت جاتی ہیں جب سب کے جانور پانی پی کر چلے جاتے ہیں اور ہمارے جانور بچا ہوا پانی پی لیتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کنویں سے پانی خود نکالا اور ان لڑکیوں کے جانوروں نے پیٹ بھر کر پانی پیا، اور لڑکیاں گھر واپس چلی گئیں۔ انہوں نے اپنے والد صاحب سے درخواست کی کہ موسیٰ علیہ السلام کو نوکر کے طور پر رکھ لیں۔ کیونکہ وہ قوی بھی

Scanned with CamScanner

ہیں اور امین بھی ہیں یعنی وہ کام کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں اور ایماندار بھی ہیں۔ پس کوئی عہدہ سونپنے سے پہلے یہ دونوں شرائط ایک وقت پوری ہونی چاہئیں ورنہ یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

پس کسی ادارے یا حکومت کے قیام کیلئے مندرجہ ذیل قوانین لاگو ہونے چاہئیں۔

۱۔ اصل حکمران اللہ ہے اور اسی کا حکم چلنا چاہیے۔

۲۔ تمام حکومتیں اللہ کے احکام یا اُسکی نمائندہ ہیں۔

۳۔ کسی بھی ملک میں صحیح طاقت اللہ کی ہے۔

۴۔ کسی اختلاف کی صورت میں انصاف کرتے وقت نسل، زبان، رنگ یا مذہبی اعتقاد کا لحاظ نہیں کیا جانا چاہیے۔

۵۔ عہدوں کی تقسیم آبادی کے تناسب پر نہیں ہونی چاہیے۔ صرف اہل اور قابل لوگوں کو ہی ذمہ داری سونپی جانی چاہیے۔

۶۔ چونکہ لوگ دنیا میں اللہ کے نمائندے ہیں اس لئے ان کو چاہیے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں اللہ کے احکام اور ہدایت پر عمل کریں۔

اب میں آپ کی توجہ اس واقعہ کی طرف دلاتا ہوں جب حضرت محمد ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تو اس وقت حضرت علیؓ کو اپنی جگہ بستر پر سلا کر یہ ہدایت دی کہ صبح ہوتے ہی جس شخص کی جو بھی امانت میرے پاس موجود ہے اسے ان کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ وہ وقت تھا جب تمام قبیلوں نے ایک ساتھ مل کر حضرت محمد ﷺ کے گھر کو گھیر لیا تھا تاکہ توبہ نعوذ باللہ انہیں قتل کیا جا سکے۔ اور دوسری طرف آپ کے کردار کی عظمت دیکھئے کہ آپ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی امانتیں واپس کرنے کا حکم دیا کیونکہ امانت میں خیانت بہت بڑا گناہ ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ہم کو ہدایت دے کہ ہم اپنی امانتوں اور وعدوں کو اسی طرح پورا کرنے کی کوشش کریں۔ (آمین)

علامہ اقبال کا تصور خودی

(عبدالرشید ساہی)

خودی کیا ہے؟ خود اپنے اسرار رموز سے واقفیت اور اپنی حقیقت سے آگاہی خودی کہلاتی ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے مکمل آگاہی حاصل کر لے تو ذات حق کو بے پردہ دیکھ سکتا ہے دیدار حق کے لئے شرط اول یہی ہے کہ وہ خود اپنی نظر سے پوشیدہ نہ ہو۔

''ہر شخص کی زندگی روح کے تابع ہے اور روح اللہ کو دیکھ چکی ہے جو بندہ اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے وہ اس دنیا میں بھی اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔''

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے اور تیری خودی تجھ پر آشکارا ہو جائے تو تیری تمام تر بدبختی ختم ہو جائے اور پھر تو ہر برے کام سے خود بخود اجتناب کرنے لگے یہی نہیں بلکہ اگر تو اپنی خودی کو محکم کرے پھر تو اس بزم جہان کو بھی درہم برہم کر سکتا ہے۔ تو زندگی کے رموز سے باخبر ہو جا اور غیر اللہ سے بے خبر۔ خودی کے نور سے اپنے آپ کو زندہ کر اس کے بغیر تو مردہ ہے۔

خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات ۔
خودی کیا ہے بیداری کائنات

عرفان خودی صرف اپنی ذات اور وجود باری تعالیٰ کا ہی یقین نہیں دلاتی بلکہ پوری کائنات کے متعلق حصول علم کا ذریعہ بھی ہے۔ عرفان خودی کے اندر خود شناس بھی ہے اور جہاں شناسی بھی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے ''**من عرفا نفسه فقد عرفا ربه**'' جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا گویا کہ اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا خودی زندہ و تابندہ ہونا لازمی ہے۔

جب تک خودی زندہ و محکم نہیں ہوگی وہ محض ایک بے جان لاش ہے اس میں روح پھونکے بغیر نیابت الہٰی کے انسانی معراج تک پہنچنا محال ہے۔

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقام رنگ و بو کا راز پا جا

خودی کا عروج یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو ذات کبریا کی ہستی میں گم کر دے اور خالق کائنات کے لافانی اور اپنی ہستی کے فانی ہو جانے کا یقین کرے۔ خودی کو ہر لمحہ زندہ رکھنا عین

حیات ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہئے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

جب انسان کے اندر اپنے فانی ہونے کا تصور محکم ہو جاتا ہے تو انسان اپنے آپ کو خدائی ضابطوں کا پابند بنالیتا ہے اور مخلوق ہونے کے ناطے خالق کی اطاعت اور محبت میں زندگی بسر کرتا ہے اور اس پر اس کائنات کے پوشیدہ خزانے آشکارا ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

خودی کی ہے یہ منزل اولین
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علامہ اقبالؒ نے خودی کو مرکز و محور بنا کر عالم اسلام اور عالم انسانیت کو خودی کا درس دیا اور کار ساز عالم کے راز افشا کر دیئے خودی کیا ہے؟ رب کائنات کی عنایات پر صبر اور شکر کرنا، ہوس و حرص اور طمعہ و لالچ سے بچ جانا، آئین فطرت کی پاسداری کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا، خدائی حدود کو پھلانگنے سے اجتناب کرنا اور مستقل مزاجی اور وقار سے زندگی بسر کرنا ہی خودی ہے۔ بقا صرف ان لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو خودی کو ایک پل کیلئے بھی خود سے جدا نہیں ہونے دیتے۔ ضمیر کو نیلام ہونے سے بچالینا خودی ہے خودی کے پاسبان لوگ ہی اصل میں ہدایت یافتہ اور کامیاب و کامران قرار پاتے ہیں خودی کوئی شاعرانہ استعارہ نہیں بلکہ یہ ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے۔

رب کبریا تک رسائی کا زینہ خودی، مقصد حیات کا قرینہ خودی، بحر تفکرات کو پار کرنے کا سفینہ خودی خودی ایک ایسا منفرد آلہ ہے جس کی مدد سے انسانی تخلیق کے تمام تر اعلیٰ مقاصد سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور اس کی مدد سے رب کریم کی اس اعلیٰ اور احسن التقویم تخلیق سے مکمل آگاہی ممکن ہو سکتی ہے۔ انسان جو کہ رب کائنات کی مصوری کا شاہکار ہے، اشرف المخلوقات ہے، **مسجود الملائک** ہے، زمین پر خدا کا نائب ہے، مخدوم موجودات ہے۔

انسان کی اصل بدنصیبی یہی ہے کہ وہ اپنے مقام کو بھول جاتا ہے اور اپنی خودی سے ناآشنا ہو کر اپنی باعزت حیثیت کو فراموش کر دیتا ہے اسے یاد نہیں رہتا کہ یہ کتنا عظیم ہے کس قدر لائق

تعظیم وتکریم ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لقد کرمنابنی آدم** ''یعنی ہم نے انسان کولائق عزت قرار دیا ہے''۔

علامہ فرماتے ہیں

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں فرشتہ و حور
کہ شاہین شہر لولاک ہے تو

چند سانسوں کا مزہ حاصل کرنے کے لئے عاقبت برباد کر لینا کہاں کی دانائی ہے۔ گناہ کے چند لمحات کی لذت پر عمر بھر کی ندامت اور شرمندگی اٹھالینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ انسان کو اپنے مقام کی رفعت اور عروج پر ہر گھڑی نظر رکھنی چاہئے۔

حدیث قدسی ہے ''خدا نے انسان کو اپنی صورت سے بنایا ہے''

اقبال خدا پرستی کو خود پرستی کا رہین منت قرار دیتا ہے۔ کہ بلکہ وہ واضح طور پر کہتا ہے کہ جو شخص خود کا منکر ہے وہ خدا کا بھی لازماً منکر ہوگا۔

افعال کے انجام پر نظر رکھنا تیرے نور بصیرت کی نشانی ہے اور خواہش نفسانی میں گرفتار رہنا درحقیقت تمہارے اندھے پن کی علامت ہے۔ چشم قلب کو مشاہدات نفسانیہ سے بچاؤ تاکہ انوار و تجلیات حق کا مشاہدہ کر سکو اپنے خواص باطنیہ کو احساسات نفسانیہ سے محفوظ رکھو تاکہ حق تعالیٰ کے اسرار و حقائق کا ادراک حاصل کر سکو۔

عرفان نفس علامہ اقبال کے فلسفہ کا نچوڑ ہے اسی کی تبلیغ ان کی زندگی کا مقصود تھا اسی علم کے وہ عارف تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا والے اسی کو ان سے سیکھیں اور خصوصاً مسلمان اس شرار جستہ کو ان سے حاصل کریں اور اس کے نور سے اپنی شب تاریک کو روشن کر لیں اور خالق سے مخلوق کی شناسائی ہو جائے۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولا کو شہباز سے

میاں محمد صاحب آف کھڑی شریف فرماتے ہیں۔

جے رب دل دیاں اکھاں دیوے اتے ہووے فضل حضوروں
عاشق تائیں نظری آوے کیا نیڑے کیا دوروں

علامہ اقبال فرماتے ہیں خودی کا اظہار ہی توحید کا اقرار ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

قرآن حکیم کے مطابق سب روحیں ذاتِ کبریا سے آشنا ہیں کیونکہ عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے سب روحوں کو اکٹھا کر کے انہیں درشن و دیدار کرایا اور اس کے بعد یہ سوال کیا

''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟''

سب روحوں نے یک زبان اقرار کیا'' کیوں نہیں آپ ہی ہمارے رب ہیں''

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں میں اپنی روح کا نور پھونکا ہے اس وجہ سے زمانہ میں بہت سارے انسان مولا صفات ہو کر گزرے ہیں۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کے مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

مشاھدہ غیبی

(ابن طاہر)

علم تصوف کا مقصود ایسی چیزوں کا مشاہدہ اور عرفان ہے جن کا تعلق غیب سے ہے۔ یعنی ان چیزوں کا مشاہدہ جن پر ہم بے دیکھے ایمان رکھتے ہیں مثلاً یوم آخرت، جنت، دوزخ، فرشتے اور سب سے بڑھ کر ذات احدیت چونکہ یہ تمام اشیاء مادے سے ماورا ہیں اس لئے ہم اسے مادی حواس سے نہیں جانچ سکتے۔ ان کو جانچنے کیلئے غیر مادی حواس کی ضرورت ہے جو کہ ہر انسان میں قدرتی طور پر پائے جاتے ہیں۔ یہ حواس بالکل اسی طرح کام کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے مادی حواس کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عزوجل نے انسان کو اس مادی کائنات سے تعلق پیدا کرنے کے لیے پانچ بنیادی مادی حواس عطا فرمائے ہیں جنہیں حواس خمسہ کہتے ہیں۔

ہماری ساری مادی زندگی کا تمام مشاہدہ ان حواس کے تابع ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک حس ختم ہو جائے تو ہم اُس حس کے متعلق مشاہدات حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً ایک اندھا آدمی، کہ جس کی دیکھنے کی حس ختم ہو چکی ہے، ایک خوبصورت کبوتر یا ہد ہد کی تعریف بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس مادی منظر کو دیکھنے والے حواس سے محروم ہے۔ یہاں پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک پیدائشی نابینا حافظ جی تھے۔ ایک دفعہ وہ ایک دعوت پر گئے تو صاحب خانہ نے پوچھا کہ حافظ جی کھیر کھاؤ گے، تو حافظ صاحب فرمانے لگے کہ بھئی یہ کھیر کیسی ہوتی ہے۔ تو صاحب خانہ نے کہا بگلے کی طرح سفید ہوتی ہے۔ حافظ جی کہنے لگے کہ بھئی یہ بگلہ کیسا ہوتا ہے۔ تو صاحب خانہ نے ہاتھ کو چونچ کی مانند بناتے ہوئے کہا کہ حافظ صاحب اس طرح ہوتا ہے۔ تو حافظ صاحب نے صاحب خانہ کے چونچ کی مانند بنے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ پھیرا تو کہنے لگے استغفراللہ یہ تو ٹیڑھی ہے ہم سے تو نہ کھائی جائے گی۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا لیکن حقیقت میں جب ہم کسی مادی حس سے محروم ہوں تو اس کے متعلق مشاہدہ اور علم حاصل نہیں کر سکتے۔ بالکل اسی طرح جب ہم روحانی حواس سے محروم ہوں تو روحانی مشاہدہ اور عرفان دونوں ہماری پہنچ سے باہر ہیں۔ تمام صوفیائے عظام ساری زندگی انہی طریقوں کی ترویج کرتے ہیں کہ جن پر عمل کرنے سے ہمارے روحانی حواس بیدار ہوتے ہیں اور ہم مشاہدہ روحانی کے قابل ہوتے ہیں۔ سارے

صوفیاء خواہ ان کا تعلق کسی بھی سلسلہ طریقت سے ہو ان حواس روحانی پر متفق ہیں اور انہیں لطائف کا نام دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ناموں اور مقامات پر اختلاف موجود ہے لیکن ان کا ذکر تمام قابل ذکر صوفیاء نے کیا اور ان سے متعلق اذکار پر خود بھی عمل کیا اور مریدوں سے بھی کروایا۔ یہاں تک کہ اسے باقاعدہ مدون کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تقریباً ہر سلسلہ ہائے طریقت میں یہ باقاعدہ سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً خاندان نقشبندیہ مجددیہ کے پہلے سات اسباق انہی لطائف کی پریکٹس ہے۔ یعنی پہلا سبق لطیفہ قلب، دوسرا لطیفہ روح، تیسرا لطیفہ سیر، چوتھا لطیفہ خفی، پانچواں لطیفہ اخفا، چھٹا لطیفہ نفس اور ساتواں لطیفہ قابسہ ہے جسے سلطان الاذکار بھی کہتے ہیں۔ سلسلہ قادریہ کے پہلے اسباق بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ یعنی مخصوص پریکٹس سے ان لطائف یا دوسرے الفاظ میں روحانی حواس کو اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ وہ پوری طرح اپنا کام کرنے کے قابل ہو جائیں اور پھر مشاہدہ روحانی شروع ہو جائے جسے مشائخ سیر کا نام دیتے ہیں۔ اس کام کے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سالک ہر وقت اُسی کیفیت اور ماحول میں رہنے کی پریکٹس کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ لطائف کے اذکار کرنے کے باوجود مشاہدہ غیبی سے محروم رہے گا۔ میرے اکثر دوست شکایت کرتے ہیں کہ لطائف کے اذکار کرنے کے باوجود مشاہدہ غیبی نصیب نہیں ہوتا، تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ہر وقت اُس ماحول میں رہنے کی پریکٹس کرنا پڑے گی۔ اس کے لئے صوفیائے عظام نے مختلف طریقے ایجاد کیے ہیں۔ مثلاً خاندان نقشبندیہ کے مشائخ نے وقوف قلبی کا طریقہ ایجاد کیا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ سالک ہر وقت چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے یہ خیال کرے کہ میرا دل اللہ اللہ کہہ رہا ہے اور میرے کان سن رہے ہیں۔

موجودہ دور کے سب سے بڑے محقق فقیر اور عظیم صوفی بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ جناب حضرت عبدالحکیم انصاریؒ نے بھی اسی مقصد کے لیے ایک طریقہ ایجاد کیا ہے جو کہ میری سمجھ کے مطابق سب سے سہل اور ارفع ہے۔ سالک کو اس ماحول میں رکھنے کے لیے آپؒ نے دو طریقے سالکان حقیقت کو بتائے ہیں جن پر عمل کر کے ہزاروں سالکان منزل مقصود سے ہمکنار ہوئے ہیں ان طریقوں میں سے پہلا طریقہ تو پاس انفاس کا ذکر ہے یعنی کے سانسوں کا دھیان رکھنا۔ کوئی

سانس اللہ کی یاد کے بغیر آئے نا جائے اس سے یہ خیال کریں کہ لفظ اللہ دل سے دماغ کی چوٹی تک گیا ہے اور جب سانس باہر نکالیں تو یہ خیال کریں کہ لفظ اللہ دماغ کی چوٹی سے واپس دل میں چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذکر صرف فرصت کے لمحات میں ہی ہوسکتا ہے اس لیے حکم یہ ہے کہ فرصت کا کوئی لمحہ اس سے خالی نہ رہے۔ آہستہ آہستہ جب عادت ہو جائے گی تو معروفیت کے دوران بھی یہ ذکر جاری رہے گا۔

دوسرا طریقہ آپؒ نے قطع ماسوائے اللہ کا بتایا ہے۔ یہ ذکر نہیں ہے بلکہ مجاہدہ ہے جو کہ آپ کو اپنی طبیعت کے خلاف کرنا ہوتا ہے اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ سالک کو روزمرہ زندگی میں جو معاملات غمی، خوشی کے پیش آتے ہیں سالک ان کا اثر دل پر نہ ہونے دے۔ اور فوراً دل کو اللہ کی یاد کی طرف متوجہ کردے۔ یہ ایسا طریقہ ہے کہ انسان کو حضوری ہونے لگتی ہے۔ اور سارے روحانی حواس اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اور کسی زیادہ محنت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ نہ لطائف چلانے کی حاجت اس میں ہے اور نہ ہی گھنٹوں مراقب رہنے کی۔ بلکہ مراقبہ کرنے کے بغیر ہی مراقبے کی کیفیات سالک پر وارد ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ ہمارے تجربے کی بات ہے کوئی کتابی بات نہیں ہے۔ تمام سالکین راہ خدا کو چاہئے کہ ان باتوں پر عمل کریں تا کہ وہ بخیر وخوبی یہ راستہ طے کرسکیں۔

اللہ تعالیٰ عزوجل سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی سچی محبت نصیب فرمائے اور عالم روحانی کا صحیح مشاہدہ اور عرفان نصیب فرمائے۔ اور ہم پر مادی تحقیق کے ساتھ ساتھ روحانی تحقیق کے دروازے بھی کھول دے تا کہ یہ مضطرب دنیا بھی سکون حقیقی سے آراستہ اور مالک ابدی کی حقیقت سے آشنا ہو جائے۔ آمین

Scanned with CamScanner

مسلم اُمۃ کے مسائل کا حل

(آفتاب عروج)

(مسلکی ،فروعی تضادات کی وجہ سے قوم ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی" (طٰہٰ 124)

قرآن کریم نے مومن یا مسلم ہونے کے لئے ایک کسوٹی ،ایک معیار یا پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ مسلم اُمہ خدا کے اس معیار یا پیمانے پر پوری نہیں اتر رہی۔ مجھ ناچیز ،کم علم کی دانست میں وہ معیار یا کسوٹی یہ ہے۔ آیئے اس کسوٹی کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھیں۔ ترجمہ: "خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا، ایسا کرو گے تو بزدل ہو جاؤ گے، تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔" (انفعال 46) مسلم امہ نے تو آپس میں لڑائی جھگڑوں کے ریکارڈ قائم کر رکھے ہیں۔ ہماری تاریخ باہمی لڑائی جھگڑوں سے بھری پڑی ہے۔ گزشتہ ادوار کو تو چھوڑیئے کہ وہ ہمارے بس میں نہ تھے۔ پاکستان کی اُنسٹھ سالہ تاریخ میں باہمی لڑائی جھگڑوں کو شمار کریں تو شائد ہی ہمیں کبھی ندامت محسوس ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رحمت نے ہمیں بھائی بھائی بنایا تھا ہم نے بے گناہ اپنے ہزاروں کلمہ گو بھائیوں کو قتل کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس بہیمانہ عمل میں بزعم خود بڑے بڑے گروہ ملوث یا سرپرست رہے ہیں۔ اب کسی دشمن کو ہم پر حملہ کرنے کی ضرورت نہ رہی اور نہ ہی ہم میں سکت باقی رہی۔ ہم بزدل ہو چکے ہیں۔ ہمارا اقبال تو مدت ہوئی خواب بن کے رہ گیا ہے۔ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے باغی ہیں۔ ترجمہ: "اور دیکھو، بیدل نہ ہونا اور نہ غم کرنا اگر تم مومن صادق ہو تو تم ہی غالب رہو گے" (3/139) مومنوں کی مدد کرنا خدا پر فرض ہے (الروم 47) یہ آیت کریمہ پڑھ کر مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اللہ جل شانہ نے تو اپنے آپ پر مومنوں کی نصرت و مدد کرنا فرض قرار دیا ہے۔ اسی طرح "ہم نے تم کو امت معتدل (توازن بدوش ،دنیا میں توازن قائم رکھنے والی) بنایا تا کہ تم دنیا کے نگران بنو اور پیغمبر آخرالزماں تم پر نگران بنیں۔ (البقرہ 143) جبکہ ہماری نگرانی تو غیر مسلم کر رہے ہیں۔ نگرانی بھی کر رہے ہیں اور تذلیل بھی۔ اب ہمارے اعمال ضائع جا رہے ہیں۔ ارشاد خداوندی کے مطابق خدا نے جو چیز (القرآن) نازل فرمائی۔ انہوں نے (ہم نے) اس کو ناپسند کیا تو خدا نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے۔ اسی وجہ سے تباہی و بربادی ،شکست و ادبار کے ہولناک عفریت ہمارا مقدر

ٹھہرائے گئے لیکن تقلید وروایات کا سحر اس قدر شدید ہے کہ ہم اپنی تباہی و بربادی کا احساس نہیں کر پا رہے۔

ہم تو ابھی تک فرقہ وارانہ اور فرسودہ فسادات سے ہی نجات حاصل نہیں کر سکے، چہ جائیکہ ہم دنیا میں اپنا مقام و مرتبہ یا کوئی بین الاقوامی کردار ادا کر سکیں اور نہ ہی اس ضمن میں پاکستان یا بیرون پاکستان کسی ادارہ، کسی عالم، کسی دانشور کو توفیق ہوئی ہے کہ اس جاہلی عصبیت سے نکل کر غور و فکر کر کے اتحاد و اتفاق کی راہیں تلاش کریں اور باہمی مکالمہ کی کوئی صورت نکالیں۔ (نیتیں درست ہوں تو یہ ناممکنات میں سے نہیں) ان فقہی، فروعی تضادات کی وجہ سے قوم ذہنی خلفشار میں مبتلا ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان کے دعوے دار ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس سے بڑا جہنم اور کیا ہوگا؟ لیکن قیادت و سیادت کی وراثت پر اپنے دائمی حق کے علمبردار اپنے اپنے فرقہ کی بنسری بجا رہے ہیں اور (روم) جل رہا ہے کہ مصداق ہم مختلف طبقات اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ''یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں'' (الانبیاء 92) بعد میں جن لوگوں نے کسی بھی وجہ سے اپنی نسبت فرقوں کے حوالے سے کرائی قرآنی حکم کے مطابق مشرک ٹھہرے۔ ترجمہ: مومنو! اس خدا کی طرف رجوع کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز پڑھتے رہو اور مشرکوں میں سے نہ ہونا، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقہ درفرقہ ہو گئے۔ سب فرقے اس پر خوش ہیں جو ان کے پاس ہے'' (لروم: 31,32) اور شرک ناقابل معافی جرم ہے جو بغاوت کے زمرہ میں آتا ہے۔ نبی اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ ترجمہ: ''جن لوگوں نے اپنے خدا کے دین میں بہت راستے نکالے (ہم نے تو فرار کے بے شمار راستے اور طریقے نکال رکھے ہیں) اور کئی کئی فرقے ہو گئے، اے رسولؐ ان سے تمہارا کوئی تعلق واسطہ نہیں'' (انعام: 169)۔

جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب (القرآن) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں (مائدہ: 44,45,47) ہماری قوم اور ہماری قیادت کا طرز عمل منافقانہ ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ آنکھوں پر عقیدت کی پٹی بندھی ہو تو دوسری بات ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو دین اور دنیا کے علیحدہ علیحدہ پلڑوں میں ڈال رکھا ہے۔ ایک پلڑے میں دنیا مراد رکھی ہوئی ہے اور اس میں بلاامتیاز ہر وہ چیز ڈالتے چلے جا رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے حرام قرار دے رکھی ہیں۔ دوسرے پلڑے میں دکھاوے کی خاطر تھوڑا سا مذہب بھی رکھا ہوا

ہے اور وہ بھی چند رسومات پرستش و پوجا پاٹ کی حد تک ہے۔

معیشت، دیانت، عدل و انصاف، فرائض منصبی کا تقدس، عہد کی پابندی، انسان کا بحیثیت انسان احترام، عفو و درگزر، اخوت و بھائی چارہ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یتیموں (جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے) مسکینوں (جن کا چلتا ہوا کاروبار یا ذرائع رزق کسی حادثہ یا ناموافق حالات کے جبر کی وجہ سے بند ہو جائے) مسافروں، دائمی مریضوں کی مدد اور بلا استثناء ان کی بحالی ان کی عزت نفس کا تحفظ اور اس کا مستقل بنیادوں پر انتظام و انصرام یہ چیزیں ہمارے معاشرے میں مفقود ہیں۔ صلوٰۃ جو برائیوں (نہی المنکر) کو روکنے کی ضامن تھی۔ یہی وہ متذکرہ اقدار و فرائض تھے جو مسلم معاشرہ کی روح تھے۔ انہی اقدار و اوصاف پر مسلم معاشرہ کا ڈھانچہ استوار تھا۔ میرے اللہ اور میرے نبی اکرمؐ کی یہ رحمت و نعمت تھی، ان میں اعلیٰ ترین اخلاق و کردار کا انقلاب برپا کر کے دنیا میں تمکن و سرفرازی و امامت عطا فرمائی۔ انہی اقدار و اوصاف کو دیکھ کر ہی لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہوئے تھے ورنہ اہل عرب بھی دنیا کے دوسرے انسانوں کی طرح کے انسان تھے بلکہ ان سے بھی فروتر، ان کے سروں پر سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے تھے جو لوگ انہیں دیکھ کر اسلام قبول کرتے۔

آج ہم اپنے دینی مدارس میں اسلامی تعلیمات کو جدید دور کے معروضی اور زمینی حقائق اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے سے کیوں گریزاں ہیں؟ کیا ایسا کرنے سے ہمارے دین کو خطرہ لاحق ہو جائے گا؟ کیا ہمارا ایمان اس قدر کچے دھاگے سے بندھا ہے کہ جیسے ہی ہم نے اپنے مذہبی نصاب سے ہٹ کر کوئی دوسری کتاب پڑھی یا پڑھائی ہم گمراہ ہو سکتے ہیں؟ کیا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں سائنسی اقتصادی اور انجینئرنگ سے متعلق علوم کے حصول سے منع فرمایا ہے؟ یا ہم اپنی کم علمی، نااہلی کے احساس شکست خوردگی سے خوف زدہ ہیں؟ اگر ہمارا موجودہ نہج زندگی اور فہم اسلام صحیح ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم صراط مستقیم پر ہیں۔ ہم اپنی منزل حاصل کر لیں گے تو پھر ہم دنیا کی تمام اقوام سے فروتر، کمزور اور ہمارا ذہن پسماندہ اور کم علم کیوں ہیں؟ جب کہ یورپ، امریکہ نے مسلم امہ کو غلام کیوں بنا رکھا؟ جیسے بنی اسرائیل کو فرعون نے غلام بنا رکھا تھا۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ اب ہمیں اسرائیلی فرعون سے نجات دلانے کے لئے کون آئے گا؟ اس کا جواب تلاش کیا جانا چاہئے۔ شنید ہے کہ اندھے یورپ کو روشنی دینے والے ہم ہی تھے تو پھر اب ہمارے جوہر ادراک کی کلید کہاں کھو گئی؟ ہمارے دیے کا تیل کیونکر ختم ہو گیا؟ کس نے کیا؟ جب کہ روشنی کا منبع نور بھی

ہمارے پاس ہے، اس کا دامن ہمارے ہاتھ سے کب چھوٹا؟ وہ تو قدم قدم پر ہمارا ہاتھ پکڑتا، سہارا دیتا اور کہتا ہے، **افلا تعقلون** (البقرۃ76) **اولا یعلمون** (البقرۃ77) **افلا یتدبرون القرآن**، عقل والوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے۔ (40:54) اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے۔ (67:10) اور مسلمانوں میں نیوٹن، آئن سٹائن، اور اسٹیفن ہاکنگ کیوں نہیں ہیں؟ کیا مسلم امہ بانجھ ہو چکی ہے؟ ایک کہاوت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ بڑی مدت سے کوئی دیدہ ور پیدا نہیں ہوتا جو ہوتا ہے مسلمان کے گھر میں پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے تو صاحبان عقل و دانش کو کائنات پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ جدید علوم حاصل کئے بغیر ہم سائنسی آلات بنا سکتے ہیں، نہ کائنات پر غور و فکر اور مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ جدید سائنسی علوم حاصل کئے بغیر موجودہ روایتی تعلیمی ڈھانچہ جدید ترقی یافتہ دور کا ساتھ نہیں دے رہا۔ جدید سائنسی علوم حاصل کئے بغیر ہم اپنا کھویا ہوا تمکن حاصل کرنا تو درکنار ہم تو اپنی حفاظت و دفاع کے لئے بھی (کافروں) کے محتاج ہیں۔ کیا ان علوم کو حاصل کرنے کی ذمہ داری (معروف معنی ہیں) صرف مسٹر قسم کے لوگوں پر عائد ہوتی ہے؟ ہمارے دینی مدارس میں ابن الہشیم، عبدالملک اصمعی، ابوعثمان عمر الجاحظ، فارابی، بوعلی سینا پیدا نہیں ہو سکتے؟ اگر آپ ایسا ہی تسلیم کرتے ہیں تو آپ دیدہ دانستہ یا سادگی میں اس قوم بلکہ تمام مسلم امہ میں سیکولرزم کے غلبہ کی راہ ہموار کر رہے ہیں کیا ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ صدی قبل کی صورت حال میں کھڑے ہیں اور ہم نے قوم کو دو طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ کی قیادت مذہبی علماء کر رہے ہیں جب کہ دوسرے کثیر حصہ کی قیادت مسٹر قسم کے مسلمان رہنما کر رہے ہیں۔ یہ ثنویت غیر قرآنی، غیر اسلامی ہے اور ہماری قوم کے لئے خطرناک صورت حال کا اشارہ ہے۔ یہ ندی کے دو کنارے ہیں جو کبھی بھی آپس میں نہیں مل سکتے۔ ہماری پسماندگی کا یہی بڑا سبب ہے کہ قومی قیادت فکری تضادات کا شکار ہے جب کہ دنیا کے کسی بھی دوسرے غیر مسلم ملک میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ یہ اسی فکری پراگندگی کا نتیجہ ہے کہ یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ریاست کو مذہبی معاملات سے الگ رکھا جائے۔ ایسی صورت حال میں آپ دونوں طبقات کے رہنما اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہو سکیں گے؟ شائد اللہ جل شانہ نے ایسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ترجمہ: ”ہم نے ان کو امام بنایا تھا، وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔“ (28:41) (بشکریہ روزنامہ جنگ)

عہدنبویؐ کی سیاستکاری کے اصول

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

خبر رسانی اور ناکہ بند

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلے میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا، وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل وحرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل وحرکت سے اُسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لئے مکے میں بھی آپؐ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں قریش نے مدینے کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس بارہ ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں آنحضرتؐ عرب کے شمال میں دُومتہ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپؐ کا آدھے راستے سے واپس آجانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتے کی مُہلت پا کر خندق کی کھدائی مکمل کرنا، خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کی مہم کی تیاری ایک شخص نے مدینے سے قریش کو لکھ بھیجی تو پیام رساں راستے پر پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ناکوں کی بندش (حبس طرق) جتنی مکمل ہو چکی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکے کی طرف چلتا ہے اور مضافاتِ مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں سفر کر کے چکر کھا کر منزلِ مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیرِ عمل تھا۔ اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ "صرف تبوک کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ تو یہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔"

معاشی دباؤ

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرتؐ اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترکِ وطن پر مجبور کیا تھا۔ اور کس طرح ان مہاجرین کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیاء کے ذریعے سے وہ نفع کمایا کرتے تھے۔ اور اس غرض کے لئے

سردیوں میں جنوب یعنی شام، فلسطین، مصر، عراق وغیرہ جایا کرتا تھے۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے۔اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقہ کے باشندوں سے آنحضرت صلعم نے محالفے پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے اور جب اِس کی ایک حد تک تکمیل ہوگئی تو قریشی کاروانوں کا راستہ بند کر دیا گیا اور جب وہ زور دکھا کر گزرنے لگے تو اِن کے کاروانوں کو حق غنیمت کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحراء میں سے ہو کر عراق جانے لگے۔لیکن جلدی ہی آنحضرت ﷺ کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے غلہ ملتا تھا۔ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہونے پر غلے کی برآمد مکے کو روک دی گئی تھی۔ (ابن ہشام)

متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے موثر ہتھیار ثابت ہوا۔

غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اِس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوئے تھے وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرنے آئے تھے۔ دستور مملکت مدینہ میں مدینے کے یہودیوں کو اِس شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا تھا کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور نہ اِن کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں۔اطراف مدینہ کے قبائل سے بھی معاہدات میں اُسے ملحوظ رکھا گیا۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں، انھیں کاروانوں کے ٹھیرنے کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں، پانی اور دیگر ضروریات کی فروخت سے روزگار نکلتا ہے۔آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔اور دُور دُور سے بدوی تربوز، گھی، بھیڑ، بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں۔قریشی کاروانوں کے رُک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرت صلعم سے مدد طلب کی تھی۔اور اشجع وغیرہ اسی طرح حلیف

بنے تھے۔ (حوالہ ابن سعد)۔

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ صلح حدیبیہ ہے 6ھ میں مدینہ میں مسلمانوں کو دو خطرے تھے، شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ، دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھنے والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینے کو فوج سے خالی پا کر مکے والے آ کر نہ لوٹ لیں۔ اور مکے پر حملہ کریں تو یہی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دینا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے۔ (اور اس کے معاوضے میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی۔ کیونکہ قریش کو اس وقت موثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری ہی رہ گئے تھے۔ ان کو بچھڑا دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔ مزید برآں قریش یا عربوں کے کاروبار اور تجارت کی ترقی سے یہودیوں کی روز افزوں معاشی اجارہ داری کی روک تھام بھی ہو جاتی تھی۔

دشمنوں سے گھیرنا

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم وخزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں، جو مکے کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرتؐ کا ابتدا سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری۔ فتوحات کی دھاک، معاشی وسائل پر زبردست اقتدار ان تمام امور نے چوطرف کے چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرتؐ کا مطیع کر دیا تھا، اور دشمن کو اسی کے دشمنوں سے گھیر لیا جانے لگا تھا۔

دعایہ کاری

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہد نبویؐ میں برتا گیا تھا جنگ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان

کو اس پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے۔ گو آنحضرتؐ اُن پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈلوانا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی، اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اٹھا دیا، اور بے نیل ومرام واپس چلے گئے (گو یہ بھی صحیح ہے کہ ذیقعدہ کا حرام مہینہ شروع ہو رہا تھا جس میں قریش جنگ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن یا مناسب نہ تھا کہ حج کے زمانے میں مکے سے باہر رہ کر کمائی سے اپنے ہاتھوں محروم رہیں) بہر حال قریش اور یہودیوں میں غلط فہمی پیدا کرانے میں جناب رسالتؐ کا جملہ '' **لعلّنا أمرناهم** '' بھی مؤثر رہا تھا۔ مشہور حدیث **الحرب خدعة** کا بھی یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔

دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلے کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرا دی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکے میں قحط نمودار ہو گیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہو گیا تو پھر یہ بندش اٹھالی گئی، اور وہ بہت ممنون ہوئے۔ (ابن ہشام صفحہ 997 تا 998)

یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں قحط کی انتہائی شدت کے زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکے کے سردار ابوسفیان کو بھیجی گئی کہ مکے کے فقراء میں تقسیم کر دے۔

(سرخسی کی بسوط 91-10/92 اسی مؤلف کی شرح السیر الکبیر 1/69، تاریخ یعقوبی 2/57 انساب الاشرف للبلاذری (مخطوطۂ استانبول 2/715) نیز دیکھو نیچے 369۔

ان کارروائیوں سے مکے میں بیسیوں بہی خواہ پیدا ہو گئے۔ اور اسی طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

دشمن میں پھوٹ ڈلوانا

ابن قتیبہ کے اُستاد محمد بن حبیب (245) نے اپنی کتاب المنمق (مطبوعۂ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ صفحہ 237 و مابعد) میں اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب ابو ازیہر کو کسی

خانگی دشمنی سے ایک شخص نے مار ڈالا تو جناب رسالت مآبؐ کے اشارے سے حضرت حسان بن ثابتؓ نے آتشیں اشعار کہنے شروع کئے۔ اس سے قریب تھا کہ مکے کے قریش میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی لیکن عین دم آخر ابوسفیان نے دخل دہی کی۔ اور بڑے تدبر سے صورت حال کو یہ کہہ کر سنبھال لیا کہ دشمن (یعنی آنحضرتؐ) چوکس ہے، ایسے وقت خانہ جنگی کہاں کی عقلمندی ہے۔

357۔ اصول کا استنباط ہی ہمیں مقصود ہے۔ انفرادی موقع پر کامیابی یا ناکامی سے یہاں غرض نہیں۔

معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز

اس مختصر تبصرے کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ

خیارکم فی الجاهلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقهوا۔

غیر مسلم معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں۔

یہی وجہ تھی کہ عمرو بن العاصؓ کے اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انہیں انعام واکرام دیا گیا بلکہ اُن کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انہیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد بن الولید کو (باوجود اُحد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابلِ رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

یہ ظاہر ہے کہ ان موقتی سیاسی اصول کے ساتھ کچھ بنیادی اور دوامی اصول بھی تھے۔ مثلاً اپنے ہوں کہ غیر، سب کے ساتھ ہمیشہ بے لاگ انصاف کرنا، عدل میں احسان ملا کر سختی اور نرمی دونوں کا برموقع اور بروقت استعمال کرنا، نسلی اور دیگر امتیازات کو برخاست کر کے "**اکرمکم عنداللہ اتقاکم**" کو اساس الاساس بنانا وغیرہ۔

اگر سیرت النبیؐ کا ان امور کی تلاش کے لئے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورۂ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں۔ بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آسکتے ہیں۔ یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہو کر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے۔

(رسالہ سیاست حیدر آباد دکن) جنوری 1940ء)

تعلیم و تربیت

(کرنل فضل ربی)

ماہرین حرب اِس نکتے سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جنگی تیاری باقاعدہ لڑائی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ زمانہ امن میں جنگی تیاری کے سلسلے میں بہائے گئے پسینے کی قیمت کا اندازہ میدانِ جنگ میں کیا جا سکتا ہے انگریزی مقولہ Sweat Save Blood ''پسینہ بچائے خون'' سے زمانہ امن میں تربیت کی اہمیت بآسانی واضح ہو جاتی ہے۔ پوری قوم کا تعلیمی و تربیتی معیار اس درجے تک لے جانا ضروری ہے۔ جس سے پوری قوم اَشِدَّآءُ عَلَے الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (آپس میں نرم دل اور کفار پر زور آور) کا مصداق بن جائے۔ (29:48)

بقول علامہ اقبالؒ

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(ضرب کلیم، نظم مومن)

دراصل صحیح تعلیم و تربیت ہی وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ، رسول اللہؐ اور دیگر فرائض کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ قومیں دوست و دشمن کی پہچان کر سکتی ہیں۔ جب کہ جاہل معاشرہ اپنی جہالت کی بدولت اپنے نفع ونقصان سے غافل رہتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

o قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ o (9:39)

تو کہہ دے (اے پیغمبرؐ) کبھی علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں۔ بے شک وہی لوگ سوچتے ہیں جو عقل والے ہوں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

o اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا o (28:35)

بے شک اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔
اسی طرح قرآن نے علم والوں کا درجہ بلند بتایا۔

○ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ
(11:58)

اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا۔ جو ایمان اور علم والے ہیں۔
آیاتِ قرآنی کے مطابق باقی اُمور کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اُمت کی تعلیم وتربیت تھا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب اتارنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب کے ساتھ معلم کو بھیج کر تعلیم وتربیت اور خود تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

○ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ○
(151:2)

جیسا کہ ہم نے تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے۔ تمہیں پاک کرتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اور تمہیں وہ باتیں بتاتا ہے جن کو تم نہیں جانتے تھے۔
اس آیت کی روشنی میں شارح علیہ السلام کے فرائض مندرجہ ذیل متعین کئے گئے۔ تلاوت کتاب، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمہ عائد کئے گئے فریضہ کو کما حقہ، ادا کیا؟ اور اُمت کی ایسی تعلیم و تربیت فرمائی جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان؟ الفاظ میں فرمائی۔

○ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (9:59)

اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے۔ خواہ اپنے اوپر کتنی تنگی کیوں نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو تعلیم کی فضیلت بتائی۔ تاکہ مسلمان تعلیمی میدان میں اغیار پر سبقت لے جائیں۔ اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات درجہ ذیل ہیں۔

○ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم طَلَبُ الْعِلْمِ

فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ)

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔

○ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَّطْلُبُ بِهٖ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ (بخاری)

اور جو شخص تحصیل علم کیلئے راستہ چلتا ہے، اللہ تعالیٰ جنت کا راستہ اِس کے لئے آسان کر دیتا ہے۔

○ عَنْ مُعَاوِيَةَ خَطِيْبًا يَقُوْلُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ مَنْ يُّرِدُ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (بخاری)

جس شخص سے اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے۔ اسے دین کی سمجھ دیتا ہے۔

○ عَنْ اَنَسٍؓ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ (ترمذی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو طلب علم کیلئے نکلے وہ راہ خدا میں ہے یہاں تک کہ لوٹ آئے۔

اِن ارشادات کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی تعلیم کیلئے کئی عملی اقدامات کئے۔

حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار فرمائے۔

مکہ میں صبر وتحمل کی تربیت تیرہ سالہ مکی دور میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی فکری تربیت فرمائی۔ اِس دور میں شریعت مکمل نہیں تھی بلکہ عقائد سے متعلق کچھ بنیادی احکام نازل ہوئے تھے۔ احکام کا نزول مدینہ منورہ میں بتدریج ہوتا رہا، یہاں تو صرف کلمہ شہادت کہنے پر مار پڑتی۔ یہ مار اور کش مکش کسی غیر قوم کی طرف سے نہیں تھی۔ بلکہ اپنے گھر والوں، رشتہ داروں یا مالکوں (غلاموں کی صورت میں) کی طرف سے تھی۔ جیسے حضرت بلال بن رباحؓ، حضرت حباب بن ارتؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کے واقعات سے پتہ چلتا ہے۔

اِن تکالیف سے حق پرستوں کی تربیت ہوئی۔ جو اسلامی انقلاب کے لئے درکار تھی۔ اسی صبر

وتحمل اور عقیدے کی مضبوطی نے صحابہ کرامؓ کو اس اہل بنایا کہ اِن مقاصد کے دفاع کی خاطر انہوں نے ہجرت کے بعد حق و باطل کے معرکوں میں موت کو زندگی پر ترجیح دی بلکہ ان مصائب پر صبر بذات خود جہاد سے کم نہیں تھا۔ اس صبر و تحمل کو جہاد قرار دینے کے لئے قرآنی آیت۔۔۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْاط وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌo (39:22)

اِن لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ تعالیٰ اِن کی مدد پر قادر ہیں۔

اِنسانوں کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو لازم ٹھہرایا۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِo (56:51)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا

(ایمان کے بعد سب سے پہلا اور ضروری حکم نماز ہے۔)

تربیت بالعبادات نبی کریم ﷺ نے عبادت کو حصول رضائے الٰہی کے علاوہ فوجی تربیت کا ذریعہ بنایا عبادت سے تعلق مع اللہ بڑھتا ہے جو مسلمان کو بے خوف، نڈر، مطمئن اور صحت مند بنا دیتا ہے۔ ہر مسلمان مرد و عورت پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ عسکری نقطہ نظر سے نماز کے اندر جو عسکری تربیت خود بخود ہو جاتی ہے اس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

صف بندی نماز کے لئے صفیں بنانا اور صفوں کی درستگی نماز کا حصہ ہے۔ نبی کریم ﷺ صفوں کی درستگی کا بہت اہتمام فرماتے۔ حضرت سماک بن حربؓ سے روایت ہے۔

o قال سمعت النعمان بن بشير يقول كان النبی ﷺ يسوينا فی الصفوف كما يقوم القدح حتى اذا ظن ان قد اخذنا ذلك عنه وفقهنا اقبل ذات يوم بوجهه اذا رجل منتبذ بصدره فقال لتسون صفوفكم اوليخالفن الله بين وجوهكم ۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں صفوں میں برابر کھڑا کرتے جس

طرح تیر کی لکڑی کو برابر کرتے ہیں یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کو یقین ہو گیا کہ ہم نے آپ ﷺ سے صفیں قائم کرنا سیکھ لیا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک روز متوجہ ہو کر دیکھا کہ ایک آدمی اپنا سینہ آگے نکالا ہوا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم اپنی صفوں کو برابر کرو ورنہ تم میں اللہ تعالیٰ اختلاف پیدا کردے گا۔

٥عن انس قال قال رسول اللّٰه ﷺ سووا صفوفکم فان تسویۃ الصف من تمام الصلوٰۃ۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ صفیں سیدھی رکھو۔ کیونکہ صفوں کی درستگی نماز کی تکمیل میں سے ہے۔

اِسی طرح زمانہ امن و جنگ دونوں میں عساکر کو بلا کر احکام بتاتے وقت، ڈرل کرتے وقت، اجتماعی صورت میں باہر جاتے وقت، باہر سے معائنے کے لئے آئے ہوئے آفسر کو ملتے وقت، حملے کی صورت میں اور دفاع کی صورت میں (سوائے استثنائی حالتوں کے) جیسے اُمور میں صف بنانا ضروری ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے نماز کے دوران صفوں کی درستگی کا عادی بنایا۔ لہٰذا جب حق و باطل کا پہلا معرکہ ہُوا۔ تو نبی ﷺ نے اِس صف بندی کی تربیت کو پہلی دفعہ میدان کارزار میں اِستعمال کیا، غزوہ بدر میں آقائے نامدار ﷺ نے کفارِ مکہ کے مقابلہ میں مسلمانوں کی صف بندی فرمائی۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے۔

٥عن عبدالرحمن بن عوف قال رسول اللّٰه ﷺ ببدر لیلا۔ (ترمذی)

عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو اپنے مقامات مناسبہ پر جنگ بدر میں رات سے کھڑا کر دیا۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو منتشر رہنے سے باز رکھا۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے صف بندی ایسے انداز میں فرمائی کہ مسلمان اپنی اصل تعداد سے زیادہ نظر آنے لگے۔ قرآن مجید نے ان چالوں (TACTICS) کی تائید ان الفاظ میں کی ہے۔

٥ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰی کَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ

رَأْيَ الْعَيْنِ۔ (13:3)

ایک فوج اللہ کی راہ میں لڑتی اور دوسری فوج کافروں کی ہے جو اُن کو (مسلمانوں کی فوج کو اپنی آنکھوں سے ان کی اصل تعداد سے) اپنے سے دوچند دیکھتے ہیں۔

صف بندی کر کے اللہ کی راہ میں لڑنا ایک طرف تو جنگ کے سنہری اصولوں میں داخل ہے جو جنگ کی ہار جیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تو دوسری طرف یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

o اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ o (4:61)

اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اِس کی راہ میں صفیں باندھ کر ایسے لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

جدید دور کی مشینی جنگوں (**MECHANISED WARS**) میں صف بندی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ پیدل دستے کے حملے (**INFANTRY ATTACK**) کے وقت تو اِس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ دست بدست لڑائی (**HAND TO HAND FIGHT**) میں اگر جوان مربوط طریقے سے حرکت نہ کریں تو دشمن کے مورچوں تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اِس کے علاوہ دوسرے ہتھیاروں ٹینک، توپخانے، ریکالیس رائفل، مارٹر اور ٹینک شکن ہتھیار کو بھی ایک خاص ترتیب سے لگایا جاتا ہے۔ اگر یہ ہتھیار بغیر ترتیب کے لگے ہوں اور فائر بیس (**FIRE BASE**) پر اِن کی موجودگی (**PRESENCE**) قاعدے کے مطابق نہ ہو تو حملے کی صورت میں دشمن کی جگہ اپنی افواج اِن کا نشانہ بن جاتی ہے۔

<u>اطاعت امیر اور تنظیم</u> اسلام نے اجتماعی معاملات اور باہمی مسائل کو حل کرنے کیلئے باہمی مشاورت کا جو ہمہ گیر اصول دیا ہے اس کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں باہمی مشاورت کے لئے ایک مجلس کے قیام کا عمل میں لانا ضروری ہے جو مسائل اور افکار پر غور و فکر کرے۔ اور پھر اس پر حتمی رائے دے۔ حتمی رائے کے تعین کیلئے راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے ایسے راہنما کو شرعی اِصطلاح میں امیر اور فوجی اِصطلاح میں کمانڈر کہتے ہیں ایمان والوں کو اللہ اور رسول کے بعد امیر

کی اطاعت کا حکم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ۔ (59:4)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور صاحب امر کی جو تم پر ہے۔ فرمان نبویؐ ہے۔

وَلَوِ اسۡتُعۡمِلَ عَلَیۡکُمۡ عَبۡدٌ یَّقُوۡدُکُمۡ بِکِتَابِ اللّٰہِ اِسۡمَعُوۡا لَہٗ وَاَطِیۡعُوۡا۔ (مسلم)

اگر تم پر کوئی امیر مقرر کیا جائے اور وہ تمہیں اللہ کی کتاب کے مطابق چلائے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

میدانِ جنگ میں تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں امیر سے تنازعے کا مطلب شکست کو دعوت دینا ہے۔ اکثر ممالک اور خود۔۔۔۔؟

پاکستان کے فوجی قوانین میں لڑائی کے دوران امیر کی حکم عدولی کے لئے کڑی سزا ہے۔ سپاہ کے حکم عدولی کا فعل تمام فوج کیلئے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

غزوہ اُحد کے دوران نبی کریم ﷺ اور درے پر متعین امیر عبداللہ بن جبیرؓ کی امارت میں پچاس میں سے کچھ صحابہ کرامؓ نے اجتہادی حکم عدولی کی۔ اسی فعل نے دشمن کو ایک ایسی تدبیر پر عمل پیرائی کا موقع دیا۔ جس سے مسلمانوں کی واضح فتح شدید جانی نقصان میں بدل گئی۔

نماز باجماعت ادا کرنے سے اطاعتِ امیر کا جذبہ رگ رگ میں بس جاتا ہے اسی طرح ایک امام کے پیچھے بیک وقت ایک ہی عمل سے صحابہ کرامؓ میں تنظیم سے رہنے کا سلیقہ پیدا ہوا اور ایک منتشر قوم کے افراد اس عملی تربیت کے نتیجہ میں منظم قوم بن گئے۔

دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

وقت کی پابندی **اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا۔**

(بخاری)

درحقیقت نماز پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کی گئی ہے۔ دفاعی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے وقت کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ فوجی مشن کی تکمیل میں ذرا سی تاخیر یا پیشرفت ناقابل تلافی نقصان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے ایسے حالات میں عارضی کامیابی بھی دراصل شکست کا سامان پیدا کرتی ہے۔ پیش قدمی یا پسپائی (**Advance or withdrawl**) کے دوران ہر عمل بروقت کرنا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر مدمقابل اس تاخیر یا قبل از وقت اقدام سے خوب فائدہ لیتا ہے۔ بروقت اقدام کی تلقین سے متعلق دو واقعات ملاحظہ ہوں۔

- غزوہ بنو قریظہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ایک لشکر کو اسلحہ لینے کا حکم دیا اور روانگی کے وقت تلقین فرمائی کہ نماز عصر محلہ بنو قریظہ میں ادا کریں تاکہ مطلوبہ مشن غروب آفتاب سے قبل پایہ تکمیل تک پہنچ سکے۔

- غزوہ بدر سے قبل (رجب ۲ ہجری) میں نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو امیر سپاہ بنا کر نخلہ کی طرف بھیجا اور خط دیکر تلقین فرمائی کہ یہ خط دو دن کے بعد کھول دینا اور اس میں درج ذیل ہدایت پر عمل کرنا۔

رازداری کے ساتھ ساتھ اس واقعہ سے ہمیں بروقت اور برمحل فوجی کاروائی کا سبق ملتا ہے۔

باجماعت نماز کے ذریعہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے اندر وقت کی پابندی کی عادت پیدا کی۔

اخلاقی ترقی دشمن پر غلبہ پانے یا دشمن کی یلغار کو روکنے کے لئے صرف تعداد اور اسلحہ کی برتری کام نہیں آتی بلکہ حملہ یا دفاع کرنے والے افراد کی اخلاقی اقدار (**MORAL VALUES**) زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہیں۔

غزوات نبویؐ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعداد اور سامان حرب وضرب کے لحاظ سے قلیل افواج نے اپنے سے کئی گنا افواج کو شکست دی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

- كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔ (249:2)

بارہا تھوڑی جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئی۔

یاد رہے کہ نماز کی پابندی مسلمانوں کو برے اور فحش کاموں سے روکتی ہے اور ضابطہ اخلاق پروان چڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے۔

o اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ۔(45:29)

بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھنے پر صحابہ کرامؓ کی اخلاقی تربیت ہوئی۔ اور اِن اخلاقی اقدار کا مد مقابل پر گہرا اثر پڑا۔ نبی کریم ﷺ سپاہ کی اخلاقی ترقی پر بہت زور دیتے۔ میدانِ جنگ میں تائیدِ ایزدی حاصل کرنے اور **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡكُمۡ وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ o۔ (7:47)**

"اے ایمان والو! اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا فرمائے گا"۔ کے عملی نمونہ بننے کی خاطر نبی کریم ﷺ سالارِ عساکر کو تقویٰ کی تلقین فرماتے چنانچہ مروی ہے۔

o عَنۡ سُلَیۡمَانَ بۡنِ بُرَیۡدَةَ عَنۡ اَبِیۡهِ قَالَ كَانَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا اَمَّرَ اَمِیۡرًا عَلٰی جَیۡشٍ اَوۡ سَرِیَّةٍ اَوۡصَاهُ فِیۡ خَاصَّتِهٖ بِتَقۡوَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَمَنۡ مَعَهٗ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ خَیۡرًا (مسلم)

حضرت سلیمان بن بریدةؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر یا سریہ پر امیر مقرر کرتے تو اِس کو خاص طور پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا اور ساتھ والے مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کا حکم کرتے۔ (جاری)

علامہ اقبالؒ کا شغفِ قرآن

(ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی)

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک مضمون میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی ابتدائی زندگی کی دو واقعات بیان کئے ہیں جو سفر افغانستان کے دوران خود ان کی زبانی سنے تھے۔ ان میں سے ایک واقعہ جو براہ راست علامہؒ کے مطالعہ قرآن سے تعلق رکھتا ہے، درج ذیل ہے۔ مولانا ندویؒ لکھتے ہیں: جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اور ادو وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے، تو مسکرا کر فرمایا: کبھی فرصت ملتی ہے، تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔ میں نے دو چار دفعہ بتانے کا تقاضا کیا تو فرمایا: جب امتحان دے لوگے، تب بتاؤں گا۔ جب میں امتحان دے چکا اور لاہور سے گھر آیا، تو فرمایا: جب پاس ہو جاؤ گے۔ جب پاس ہو گیا اور پوچھا تو فرمایا: اچھا بتاؤں گا۔

ایک دن صبح کو حسب دستور قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آ گئے اور فرمایا: بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو، تو یہ سمجھو کہ قرآن کریم تم پر اتر رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے''۔

''ڈاکٹر اقبالؒ کہتے تھے کہ والد کا یہ فقرہ میرے دل میں اتر گیا، اور اس کی لذت دل میں اب تک محسوس کرتا ہوں۔ یہ تھا وہ تخم جو اقبالؒ کے دل میں بویا گیا اور جس کی تناور شاخیں پہنائے عالم میں ان کے موزوں نالوں کی شکل میں پھیلی ہیں''۔ (اقبال اور قرآن: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ بحوالہ رسالہ جوہر دہلی، اقبال نمبر، دسمبر 1938ء)

ظاہر ہے اس واقعے کے بعد علامہ اقبالؒ نے والد ماجد کے بتائے ہوئے اسی طریقے کے مطابق تلاوت قرآن کو اپنا اشعار بنایا اور بعد ازاں ملت اسلامیہ کو بھی یہی پیغام دیا کہ

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے، نہ رازی، نہ صاحب کشاف

علامہؒ کے قریبی دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں کہ'' علامہ جب بھی کلام پاک پڑھتے تو اس کے ایک ایک حرف پر غور کرتے، بلکہ نماز کے دوران بھی جب وہ بہ آواز بلند قرآن

مجید پڑھتے تو آیات قرآنی پر فکر کرتے ،اوران سے متاثر ہو کر رونے لگتے ۔ان کی آواز میں ایک خاص کشش تھی ۔ جب وہ قرآن پاک بہ آواز بلند پڑھتے تو سامعین کا دل پگھل جاتا''۔

(ملفوظات اقبالؒ:ص122 مرتبہ:محمود نظامی ۔اشاعت منزل بل روڈ ،لاہور)

علامہ کے ملازم علی بخش کا کہنا ہے کہ'' تلاوت قرآن کے دوران علامہ اس قدر روتے کہ ان کے آنسوؤں سے قرآں مجید کے صفحات تر ہو جاتے ،جنہیں بعد میں دھوپ میں سکھانا پڑتا''۔علی بخش ہر رات سونے سے قبل علامہؒ کے وضو کا پانی اور جائے نماز رکھ کر سوتا تھا۔

پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں تو علامہؒ کی رائے تھی کہ وہ قرآن مجید پڑھتے وقت خوب غور و فکر کریں تا کہ ان پر قرآنی اسرار و رموز وا ہوں لیکن جو لوگ صرف قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے بارے میں علامہ کی رائے یہ تھی کہ وہ اسے کثرت سے پڑھنے کی عادت ڈالیں تا کہ قلب کو نسبت محمدی حاصل ہو۔ چودھری نیاز الدین خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہئے تا کہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے۔اس نسبت محمدیہ کی تولید کے ضروری نہیں کہ قرآن کے معنی بھی آتے ہوں ،خلوص دل کے ساتھ محض قرات ہی کافی ہے''۔(مکاتب اقبال:ص302)

قرآن کے الفاظ وحی کے مطابق ہیں

علامہ اقبالؒ اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ قرآن مجید آج جس حالت میں مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے ،وہ بعینہ اسی صورت میں ہے جس طرح وہ قلب محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر نازل ہوا تھا۔اس سلسلے میں خود علامہؒ نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ فورمین کرسچین کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوت شرکت دی۔اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ہم لوگ چائے پینے بیٹھے ،تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے: چائے پی کر چلے نہ جانا ،مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے ایک کونے میں لے گئے اور کہنے لگے:اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبرؐ پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی ،انہوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا،

یا یہ عبارت ہی اسی طرح اتری تھی؟

میں نے کہا: یہ عبارت ہی اتری تھی۔

ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا کہ اقبال: تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ عبارت ہی اسی طرح اتری ہے؟ میں نے کہا: ڈاکٹر لوکس! یقین۔۔۔؟ میرا تجربہ ہے کہ مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر عبارت کیوں نہیں پوری اتری ہوگی!''

(روزگار فقیر: مطبوعہ لاہور 1966ء، ص20)

ڈاکٹر لوکس کا خیال تھا کہ لندن کی آب وہوا اور ماحول نے اقبالؒ کے ذہن وافکار پر گہرا اثر ڈالا ہوگا اور ان کی رائے بھی اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے بارے میں بعض دوسرے انگریزی مسلمانوں کی طرح ''معذرت خواہانہ'' ہوگی لیکن لندن کی زمستانی ہوائیں تو ان کی ایمانی حرارت کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی تھیں۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

لندن کے بے یقین، مادر پدر آزاد اور کھلے معاشرے نے اقبالؒ کے اسلامی خیالات میں مزید پختگی پیدا کر دی تھی۔ اس کی وجہ محض قرآن مجید سے ان کی والہانہ محبت اور وابستگی تھی۔ پچھلے پہر کی قرآن خوانی جس کی انہیں لڑکپن سے عادت تھی، لندن میں بھی کبھی ناغہ نہ ہوئی تھی۔

علامہ اقبالؒ قرآن حکیم کو فکر و فلسفہ اور سیاسیات و معاشیات کی ہر کتاب سے بلند تر کتاب سمجھتے تھے۔ جن دنوں وہ اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے، اس زمانے میں ان کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے علامہؒ سے پوچھا:

''آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں ان میں سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کونسی گزری ہے؟''

علامہؒ اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نو وارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر علامہؒ گھر کے اندر چلے گئے۔ دو تین منٹ بعد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کو انہوں نے نو وارد ملاقاتی کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا:

''یہ ہے سب سے زیادہ بلند اور حکیمانہ کتاب۔۔۔۔قرآن حکیم!''

(بحوالہ روزگارفقیر، جلد اول: صفحہ 92-93)

زمین کا مالک اللہ ہے

جن دنوں پنجاب میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے زمینیں تقسیم ہو رہی تھیں، پنجاب کے ایک روایتی پیر صاحب علامہ اقبالؒ کے پاس آئے اور ان سے زمین کے لئے سرکار برطانیہ کے نام ایک درخواست لکھ دینے کی فرمائش کی۔ علامہؒ نے کہا، درخواست تو میں لکھ دیتا ہوں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ پیش کس کے سامنے کرنی ہے؟

وہ بولے: سرکار برطانیہ کی خدمت میں!

علامہؒ نے کہا: اس کا زمین سے کیا تعلق؟

پیر صاحب یہ سن کر چپ ہو رہے۔ علامہؒ نے کہا: ایک کتاب ہے جو ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی، اس کا نام قرآن مجید ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اب آپ چاہیں تو میں یہ درخواست خدا کے نام لکھ دوں۔

گول میز کانفرنس لندن میں

ستمبر 1931ء میں برطانوی حکومت نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا تو اس میں شرکت کے لئے مولانا شوکت علی، سر آغا خاں اور محمد علی جناحؒ کے علاوہ علامہ اقبالؒ کو بھی مدعو کیا گیا۔ کانفرنس میں شرکت کے لئے علامہؒ 8 اگست کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچے جہاں تقریباً تین ہزار مسلمان ان کے استقبال کے لئے جمع تھے۔ یہ سب لوگ علامہؒ کو نیک دعاؤں کے ساتھ انگلستان رخصت کرنے آئے تھے۔ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے علامہؒ نے فرمایا:

''میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ کہ جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں۔ میرے ساتھ صرف حق وصداقت کی ایک جامع کتاب ''قرآن مجید'' ہے۔ میں اس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کی کوشش کروں گا''۔

(هماڈا انجسٹ، دہلی: اقبال صدی نمبر: صفحہ 82)

مزارات پر قرآن خوانی

علامہ اقبالؒ کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ 1905ء میں لندن روانگی سے پہلے انہوں نے درگاہ محبوبیؒ پر خاص طور سے حاضری دی تھی۔ وہ دیر تک اپنے خصوصی لحن میں تلاوت میں مشغول رہے۔ بعدازاں انہوں نے بارگاہِ محبوبی میں اپنی نظم ''التجائے مسافر'' پیش کی۔ اس نظم کا یہ شعر حضرت محبوب الٰہیؒ سے ان کی محبت کی یادگار ہے۔

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام

دگر کشادہ جبینم گل بہار تو ام

علامہ اقبالؒ کا معمول تھا کہ ہر جمعرات کو نماز فجر کے بعد حضرت سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کے مزار اقدس پر حاضری دیتے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور ایصال ثواب کرتے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بھی انہیں بڑی عقیدت تھی۔ جاوید اقبال پیدا ہوئے تو علامہؒ نے منت مانی کہ یہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت مجددؒ کے مزار پر لے جاؤں گا۔ بعد میں علامہؒ نے اس عہد کو پورا کیا۔ حضرت مجددؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد انہوں نے قرآن مجید منگوایا اور دیر تک خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کرتے رہے۔ مزار کی فضا میں ان کی آواز سے عجیب ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر قرآن مجید کو تر کر رہے تھے۔

(ہماڈا انجسٹ، دہلی: اگست 1977ء: اقبال صدی نمبر صفحہ 110)

علامہ اقبالؒ کو سلطان مراد کا یہ کردار بہت پسند تھا کہ اس نے ایک جرم سرزد ہونے کے بعد قرآن کی آیت قصاص سنتے ہی خود کو قاضی کے سامنے سزا کے لئے پیش کر دیا تھا۔ یہ ایمان افروز حکایت علامہؒ نے اسرار و رموز میں اس طرح نظم کی ہے (یہاں چند ابتدائی اشعار درج ہیں، شائقین پوری نظم ''اسرار و رموز'' میں ملاحظہ فرمائیں)

بود معمارے ز اقلیم خجند

در فن تعمیر نام او بلند

ساخت آں صنعت گر فرہاد زاد

مسجدے از حکم سلطانِ مراد

خوش نیامد شاہ را تعمیر او
خشمگیں گر دیدہ از تقصیر او
آتش سوزندہ از چشمش چکید
دست آں بیچارہ از خنجر برید

اس پوری حکایت کا ترجمہ یہ ہے:

''ترکستان میں دریائے مسیحوں کے کنارے واقع شہر خجند میں ایک معمار تھا جس کا نام فن تعمیر میں بہت بلند تھا۔ اس فرہاد زاد صنعت گر نے سلطان مراد کے حکم سے ایک مسجد تعمیر کی لیکن بادشاہ کو اس کی تعمیر پسند نہ آئی اور وہ اس بارے میں اُس کی کوتاہی دیکھ کر غصے میں آ گیا۔ بادشاہ کی آنکھوں سے غصہ میں شرارے نکلنے لگے۔ اس نے معمار کا ہاتھ خنجر سے کاٹ دیا۔ معمار کی کلائی سے خون کی ندی بہہ نکلی اور وہ کمزور ناتواں شخص قاضی کے سامنے جا کر پیش ہو گیا۔

وہ ہنر مند جس کا ہاتھ پتھر پروتا تھا، اس نے قاضی کے سامنے سلطان کے ظلم کی داستان بیان کی اور کہا کہ آپ کی زبان حق تعالیٰ کے پیغام کی ترجمان ہے اور شریعت محمدیہ کا تحفظ آپ کی ذمہ داری ہے۔ میں مردِ آزاد ہوں، بادشاہوں کی سطوت کا غلام نہیں ہوں، قرآن پاک کی رو سے میرے دعوے کا فیصلہ کیجئے۔

عادل قاضی اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس نے فوراً بادشاہ کو اپنے حضور طلب کیا۔ بادشاہ مجرموں کی طرح قاضی کے سامنے پیش ہوا تو قرآن پاک کی ہیبت سے اس کا رنگ اڑ گیا۔ شرم کے مارے اس کی نگاہیں اس کے پاؤں پر جمی تھیں اور اس کے رخسار سرخ ہو رہے تھے۔ قاضی کی عدالت میں ایک طرف فریادی اپنا دعویٰ لئے کھڑا تھا اور دوسری طرف بلند مرتبت بادشاہ!

بادشاہ نے کہا: میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں اور مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے۔ قاضی نے کہا: زندگی کا دارومدار ''قانون قصاص'' پر ہے۔ اسی قانون سے زندگی کا استحکام پاتی ہے۔ مسلمان غلام آزاد سے کمتر نہیں، نہ بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ سرخ ہے۔

جب سلطان نے قرآن پاک کی یہ آیہ محکم سنی تو اس نے اپنی آستین سے ہاتھ نکال کر آگے بڑھا دیا۔ یہ دیکھ کر مدعی (معمار) نے قرآن مجید کی آیت عدل و احسان پڑھی اور کہا ''میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر بادشاہ کو معاف کیا''۔

قرآن حکیم کے سامنے سلطان کی گردن جھک گئی انتہائی غصہ اور جلال کے عالم میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کے سامنے اپنی گردن خم کر دینا، یہی روح ایمان اور جان بندگی ہے۔ اس قسم کا ایک ایمان افروز واقعہ ہمیں خود علامہ اقبالؒ کی زندگی میں بھی ملتا ہے کہ جب وہ ایک انتہائی قریبی خاندانی معاملے میں سرتاپا جلال اور غصے میں بھرے ہوئے تھے، لیکن اس عالم میں جب ان کے سامنے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی گئی تو ان کا غصہ قطعی کافور ہو گیا اور حکم الٰہی سنتے ہی انہوں نے اپنی گردن جھکا دی۔ احترام قرآن مجید کے سلسلے کا یہ ایمان افروز واقعہ ہمیں فقیر سید وحید الدین سناتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''علامہ'' کی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی وزیر آباد میں ہوئی تھی۔ دو سال ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو ان کی ساس نے طعنے دے دے کر ان کی زندگی اجیرن کر دی۔ یہ تلخی اس قدر بڑھی کہ وہ مجبوراً میکے آ گئیں اور کئی سال تک وہیں رہیں۔ اس دوران ان کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی کر دی لیکن اس کے ہاں بھی اولاد نہ ہوئی تو ساس دوسری بہو کی بھی سوکن لے آئیں۔ علامہؒ کے بہنوئی ایک سعادت مند بیٹے کی طرح ماں کی بات مانتے رہے لیکن جب ان کی والدہ فوت ہوئیں تو انہوں نے چاہا کہ اپنی پہلی بیوی کو گھر واپس لے آئیں۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے کئی ماہ تک اپنی کوشش جاری رکھی، ان کے رشتہ دار علامہؒ کے پاس مصالحت کے لئے آتے رہے۔ پہلے تو ادھر سے انکار ہوتا رہا لیکن بہت سوچ بچار کے بعد علامہؒ کے والد اور والدہ دونوں رضامند ہو گئے۔ ساس اور سسر کی رضامندی پا کر علامہ کے بہنوئی کچھ عزیزوں کو ساتھ لے کر اپنی سسرال آ گئے۔ اتفاق سے ان دنوں علامہؒ بھی سیالکوٹ آئے ہوئے تھے، جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے بہنوئی مصالحت کی غرض سے آئے ہیں تو ان کی برہمی کی حد نہ رہی۔ والد سے کہا کہ ان لوگوں کو واپس کر دیا جائے۔ جب ان کے والد ماجد نے دیکھا کہ وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تو انہوں نے خاص انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے: ''والصلح خیر! یہ سننا تھا کہ علامہؒ بالکل خاموش ہو گئے، ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا جیسے کسی نے سلگتی ہوئی آگ پر پانی ڈال دیا ہو۔

ان کے والد نے قدرے توقف کے بعد علامہؒ سے پوچھا: ''تو بیٹا! اب کیا فیصلہ کیا جائے؟''

علامہ اقبالؒ نے جواب دیا: ''وہی جو قرآن حکیم فرماتا ہے''۔

Scanned with CamScanner

چنانچہ مصالحت ہوگئی اور چند دن بعد ان کے بہنوئی اپنی بیوی کو لے کر وزیر آباد چلے گئے۔ اللہ کے فضل سے یہ صلح خیر ثابت ہوئی اور علامہؒ کی بہن اپنے میکہ میں ہمیشہ خوش رہیں۔ گھر کا سارا اختیار ان کے ہاتھ میں رہا، کبھی شکر رنجی کی نوبت نہ آئی اور سب لوگ ایک خاندان کی حیثیت سے نہایت خوش رہے۔ علامہؒ کے بہنوئی کی دونوں بیویاں کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرا نتقال کر گئیں لیکن ان کی بہن نے طویل عمر پائی۔ اس مصالحت کے بعد علامہ کو بھی اپنے بہنوئی پر اس قدر اعتماد ہو گیا کہ وہ اپنے نجی کاموں میں بھی ان سے مشورے کرتے اور ان کی خیر خواہی کی قدر کرتے''۔ (روزگار فقیر: جلد دوم: ص 154)

لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

علامہ اقبالؒ ہمیشہ فجر کی نماز اول وقت ادا کرتے تھے اور اس کے بعد تلاوت قرآن میں مشغول ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں لحنِ داؤدی سے نوازا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب ان کی آواز بیٹھ گئی اور گلے اور سانس کی تکلیف کے باعث تلاوتِ قرآن کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو انہیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اب وہ قرآن مجید بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے۔ اس کرب کا اظہار ان کے اس شعر میں بھی موجود ہے۔

در نفس سوز جگر باقی نماند
لطف قرآنِ سحر باقی نماند

آواز کی اس محرومی کا کچھ ازالہ وہ اس طرح کر لیتے کہ جب بھی کوئی خوش اُلحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے والے قاری میسر آتے تو وہ اس سے قرآن مجید سنتے۔ علامہؒ کے بچوں (جاوید اور منیرہ) کی جرمن اتالیق ''مس ڈورالینٹ'' اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر صاحب (اقبالؒ) کو قرآن مجید سے عشق تھا۔ ایک روز انہوں نے مجھے بلایا اور کہا ''آج ایک بہت مشہور عرب قاری آنے والے ہیں، جب وہ آئیں تو بچوں کو میرے کمرے میں بھیج دینا اور اگر آپ پسند کریں تو خود بھی آجائیں، میں اس سے قرآن مجید سننا چاہتا ہوں''۔ قاری صاحب آئے تو میں بھی بچوں کے ساتھ کمرے میں گئی۔ قاری صاحب نے تلاوت شروع کی تو ڈاکٹر صاحب بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر کو پکڑے ہوئے بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔

ان کے سرہانے ہر وقت قرآن مجید موجود رہتا تھا جسے وہ اکثر پڑھتے رہتے تھے"۔
(ھماڈائجسٹ، دہلی۔ اقبال صدی نمبر: اگست 1977ء)

فاش گویم آنچہ در دل مضمراست
ایں کتاب نیست چیزے دیگر است

قرآنی اسرار ورموز قلمبند کرنے کی خواہش

حضرت علامہؒ کی خواہش تھی کہ جس طرح برسوں انہوں نے غور وفکر کر کے کلام الہٰی کے اسرار ورموز تک رسائی حاصل کی ہے، وہ اسے دوسرے مسلمانوں تک بھی پہنچائیں۔ 30 مئی 1935ء کو سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں۔ تمنا ہے مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے خیالات قلمبند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت اور طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے، اسے اسی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تا کہ قیامت کے دن آپ کے جدامجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینان سے میسر ہو، کہ اس عظیم الشان دین کی، جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجالا سکا"۔ (اقبالنامہ مجموعہ مکاتیب: حصہ اول صفحہ 361)

مگر افسوس! موت نے انہیں یہ کام مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔ اگر علامہؒ قرآن مجید سے متعلق اپنے یہ افکار قلمبند کر جاتے تو یقیناً وہ ایسے "دانائے راز" کے قرآنی افکار ہوتے، جس نے اپنی تمام عمر قرآن مجید پر غور وفکر میں گزاری تھی!!! (بشکریہ نوائے وقت)

کائنات خدا کی گواھی دیتی ھے

(مولانا وحید الدین خاں)

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (DENSITY) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے، یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے، اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اور دریاؤں جھیلوں اور سمندروں کی تہہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے، اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں، اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتا ہے، اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکہ میں انڈوتھیا (ENDOTHIA) نام کی بیماری شاہ بلوط (CHESTNUT) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پر نہیں ہوں گے" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا، اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لئے خاص تھے، یہاں تک کہ 1900ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا، مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت (TULIP EES) اپنی نشوونما کے لئے شاید انہیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے، شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی سا جزو تھے، اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے، لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں، یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے

کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

(مولانا وحید الدین خاں)

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (DENSITY) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے، یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے، اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اور دریاؤں جھیلوں اور سمندروں کی تہہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے، اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں، اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتا ہے، اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکہ میں انڈوتھیا (ENDOTHIA) نام کی بیماری شاہ بلوط (CHESTNUT) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پر نہیں ہوں گے" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا، اونچے درجے کی دیرپا عمارتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لئے خاص تھے، یہاں تک کہ 1900ء میں ایشیا سے انڈوتھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا، مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت (TULIP EES) اپنی نشوونما کے لئے شاید انہیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے، شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی سا جزو تھے، اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے، لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں، یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے

ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تہوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے، ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لئے بوئی گئی آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا، چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئی، یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی، وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کردیا اور زراعت کو ناممکن بنادیا، کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی، ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا، بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کے علاج تلاش کرنے کے لئے نکلے یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا، اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی، وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا، اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا، اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پالیا اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہوگیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط وتوازن (CHECKS AND BALANCES) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہیں؟

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے، یہ جامد و بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے، اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے اس کا ایک ہی مطلب ہوگا۔۔۔۔ ایک ایسا مرکب جس میں 11.1 فیصد ہائیڈروجن اور 88.9 فیصد آکسیجن۔ ایک سائنس داں جب تجربہ گاہ میں داخل ہوکر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے، تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتاسکتا ہے کہ پانی کا نقطہ جوش 100 درجہ سینٹی گریڈ ہے، جب تک ہوا کا دباؤ (ATMOSPHERIC PRESSURE) 760 ایم ایم رہے، اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لئے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے، اس طرح نقطہ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا، اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ 760 ایم ایم سے زیادہ ہو تو نقطہ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا، یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جاسکتا ہے کہ پانی کا نقطہ جوش کیا ہے، اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لئے کوئی بنیاد نہ

ہوتی، کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعات کے لئے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریق عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا۔

کیمیا کے میدان میں نووارد طالب علم سب سے پہلے جس کا چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے، سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (MENDELEEV) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا، جس کو دوری نقشہ (PERIODIC CHART) کہا جاتا ہے، اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے، اس لئے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے، جو عین اندازے کے مطابق بعد کو پر ہو گئے ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کئے جاتے ہیں، جوہری نمبر سے مراد مثبت برقیوں (PROTONS) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے، یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے۔ ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے، ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین، مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے، نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر 101 کی شناخت محض اس کے 17 پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی، قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (PERIODIC CHANCE) نہیں کہتے، بلکہ اس کو دوری ضابطہ (PERIODIC LAW) کہتے ہیں، مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کے انکار کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی۔

"11 اگست 1999ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا کارنوال (CORNWALL) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا"۔۔۔۔۔ یہ محض ایک قیاسی پیشن گوئی نہیں ہے بلکہ علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں، وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جا رہی ہیں، وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ

کیا جاسکتا ہے، پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک فقید المثال نظم وضبط پایا جاتا ہے، ان کے عمل میں اس درجہ کی یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہہ کرتا ہے، اس کے نتیجے میں (A.C.ADAMS) اور لاویرے (U.LEVERRIER) کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشن گوئی کرسکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا، چنانچہ ستمبر 1846ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے، جس کو ہم اب پنچوں (NEPTUNE) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہوگئی ہو۔ کائنات کی حکمت ومعنویت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایسے امکانات رکھے گئے ہیں کہ انسان بوقت ضرورت تصرف کر کے اس کو اپنے لئے استعمال کرسکے، مثال کے طور نائٹروجن کے مسئلہ کو لیجئے، ہوا کے ہر جھونکے میں نائٹروجن 78 فیصد ہوتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے کیمیائی اجزاء ہیں، جن میں نائٹروجن شامل ہوتا ہے، ان کو ہم مرکب نائٹروجن کہہ سکتے ہیں، یہی وہ نائٹروجن ہے، جس کو پودے استعمال کرتے ہیں، اور جن سے ہماری غذا کا نائٹروجنی حصہ تیار ہوتا ہے، اگر یہ نہ ہوتو انسان اور جانور بھوکوں مرجائیں۔

صرف دو طریقے ہیں جن سے قابل تحلیل نائٹروجن مٹی میں ملا کر کھاد بنتا ہے، اگر یہ نائٹروجن مٹی میں شامل نہ ہوتو کوئی بھی غذائی پودا نہ اُگے، ایک طریقہ جس سے یہ نائٹروجن مٹی میں شامل ہوتا ہے وہ مخصوص بیکٹیریائی عمل ہے، یہ بیکٹیریا پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں، اور ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کو مرکب نائٹروجن کی شکل دیتے رہتے ہیں، پودا جب سوکھ کر ختم ہوجاتا ہے تو اس مرکب نائٹروجن کا کچھ حصہ زمین میں رہ جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جس سے مٹی کو نائٹروجن ملتا ہے، وہ بجلی کا کڑکا ہے، ہر بار جب بجلی کی رو فضا میں گزرتی ہے تو وہ تھوڑے سے آکسیجن کو نائٹروجن کے ساتھ مرکب کردیتی ہے جو کہ بارش کے ذریعہ ہمارے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے، اس طرح جو نائٹریٹ نائٹروجن آسانی سے مل جاتا ہے، اس کا اندازہ سالانہ ایک ایکڑ زمین میں پانچ پونڈ ہے جو کہ تیس پونڈ سوڈیم نائٹریٹ کے برابر ہے۔

یہ دونوں طریقے بہر حال ناکافی تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ کھیت جن میں عرصہ دراز تک کھیتی

ہوتی رہتی ہے، ان کا نائٹروجن ختم ہو جاتا ہے، اور اسی لئے کاشتکار فصلوں کا الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں، یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ایسے مرحلے میں جبکہ اضافہ آبادی اور کثرت کاشت کی وجہ سے مرکب نائٹروجن کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی، اور انسان کو مستقبل میں قحط کے آثار نظر آنے لگے تھے، اور یہ صرف اس صدی کے آغاز کی بات ہے کہ عین اس وقت وہ طریقہ دریافت ہو گیا جس سے ہوا کے ذریعہ مصنوعی طور پر مرکب نائٹروجن بنایا جا سکتا ہے، مرکب نائٹروجن بنانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں، ان میں سے ایک یہ تھی، کہ فضا میں مصنوعی طور بجلی کا کڑکا پیدا کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ہوا میں بجلی کی چمک پیدا کرنے کے لئے تقریباً تین لاکھ ہارس پاور کی قوت استعمال کی گئی، اور جیسا کہ پہلے سے اندازہ کیا جا چکا تھا، ایک قلیل مقدار نائٹروجن کی تیار ہو گئی، مگر اب انسان کی خداداد عقل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انسانی تاریخ کے دس ہزار سال بعد ایسے طریقے معلوم کر لئے گئے ہیں، جن سے وہ اس گیس کو کھاد میں تبدیل کر سکتا ہے، اس کے بعد انسان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی غذا کے اس لازمی جزو کو تیار کر سکے جس کے بغیر وہ بھوکوں مر جاتا۔ یہ نہایت عجیب ''حسن اتفاق'' ہے کہ زمین کی تاریخ میں پہلی بار عین وقت پر انسان نے قلت خوراک کا حل دریافت کر لیا، یہ المیہ ٹھیک اس وقت رفع ہو گیا جب کہ اس کے واقع ہونے کا امکان تھا۔

کائنات میں اس طرح کی حکمت و معنویت کے بے شمار پہلو ہیں، ہماری تمام سائنسوں نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ہم نے معلوم کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہے وہ چیز جس کو معلوم کرنا ابھی باقی ہے، تاہم جو کچھ انسان معلوم کر چکا ہے، وہ بھی اتنا زیادہ ہے، کہ اس کے صرف عنوانات کی فہرست دینے کے لئے موجودہ کتاب سے بہت زیادہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی، اور پھر بھی کچھ عنوانات بچ رہیں گے، انسان کی زبان سے **آلاءِ رب** اور آیات الٰہی کا ہر اظہار ناقص اظہار ہے، اس کی جتنی بھی تفصیل کی جائے، جہاں زبان و قلم رکیں گے وہاں یہ احساس ضرور موجود ہوگا کہ ہم نے ''بیان'' نہیں کیا بلکہ اس کی ''تحدید'' کر دی، حقیقت یہ ہے کہ اگر سارے علوم منکشف ہو جائیں، اور اس کے بعد سارے انسان اس طرح لکھنے بیٹھ جائیں کہ دنیا کے تمام وسائل ان کے لئے مساعد ہوں، جب بھی کائنات کی حکمتوں کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ ۔(لقمان۔27)

اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ سمندروں کے ساتھ سات اور سمندر ان کی

سیاہی کا کام دیں، جب بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جس نے بھی کائنات کا کچھ مطالعہ کیا ہے، وہ بلاشبہ اعتراف کرے گا کہ کتاب الٰہی کے ان الفاظ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، وہ صرف ایک موجودہ حقیقت کا سادہ سا اظہار ہے۔

پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت و معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی دوسری توجیہہ کرتے ہیں، اس میں انہیں کسی ناظم و مدبر کا اشارہ نہیں ملتا، بلکہ یہ سب کچھ ان کے نزدیک محض ''اتفاق'' سے ہوگیا ہے، ٹی۔ ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروروں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیر کی ایک نظم (SONNET) نکل آئے، اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کے اندھا دھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی ہے۔

(THE MYSTERIOUS UNIVERSE,P3-40)

یہ بات اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے، کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے، بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں، مثلاً ہوا کا جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (POLLEN) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے، جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور استثنائی واقعہ کی توجیہہ کرتا ہے، وہ گلاب کے پورے وجود، کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جاسکتا ''اتفاقی واقعہ'' کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے، پروفیسر ایڈون (EDWIN CONKLINM) کے الفاظ میں ''زندگی کا بذریعہ حادثہ (ACCIDENT) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا''۔

(THE EVIDENCE OF GOD, P.174.)

کہا جاتا ہے کہ ''اتفاق'' کے حوالے سے کائنات کی توجیہہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سر جیمز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (PURELY MATHEMATICAL LAWS OF CHANCE) پر مبنی ہے۔ ایک مصنف

Scanned with CamScanner

لکھتا ہے:۔

''اتفاق''(CHANCE) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے۔ جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں، اس نظریہ کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں باآسانی امتیاز کرسکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کرسکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے''۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہو گیا، اور پھر یہ بھی فرض کرلیں کہ اس میں عمل اور ردعمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہو گیا، اگرچہ ان مفرضات کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔۔۔۔ جب بھی کائنات کی توجیہہ حاصل نہیں ہوتی۔۔۔ کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذاہب کی راہ میں حائل ہو گیا ہے، بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانونِ اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کررہی ہے کہ قانون اتفاق، موجودہ کائنات کا خالق ہوسکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے، اور جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔

''اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگادو، اس کے بعد انہیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملادو، اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو۔۔۔ یہ امکان کے نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمہارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمہارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمہارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان ایک دو تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں دس ہزار میں ایک ہے، یہاں تک کہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمہارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے''۔

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کریسی ماریسن (A.CRESSY MORRIOSN) لکھتا ہے:۔

"THE OBJECT IN DEALING WITH SO SIMPLE A PROBLEM IS TO SHOW HOW ENORMOUSLY

FIGURES MULTIPLY AGAINST CHANCE"

(MAN DOES NOT STAND ALONE;P.17.)

یعنی یہ سادہ مثال اس لئے دی گئی تا کہ یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہوگیا ہے، تو اس کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی، ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (LIVING CELLS) سے ہوتی ہے، خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم الخلیہ (CYTOLOGY) میں کیا جاتا ہے، ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں، ان میں سے ایک پروٹین ہے، پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے ۔۔۔۔ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک، پروٹینی (MOLECULE) ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار جواہر (ATOMS) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں، اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے، مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو، اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوئیزرلینڈ کے ایک ریاضی داں پروفیسر چارلس ایوجین گائی (CHARLES EUGENE GUYE) نے اس کا حساب لگایا ہے، اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 160/10 کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہوسکتا ہے (160/10) کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے، دوسرے لفظوں میں دس کے آگے ایک سو ساٹھ صفر، ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروروں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے، اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان 243/10 سال بعد ہے۔

پروٹین امینوایسڈ (AMINO ACIDS) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں،

اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقہ کی ہے، جس سے یہ سلسلے باہم ملیں، اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں، پروفیسر جے۔ بی لتھیز (J.B.LEATES) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں (48/10) طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لئے محض اتفاق سے یکجا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ واقعہ ظہور میں آجائے گا، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے، ایسا ہو جائے، دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے، جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے خلیہ کا جز بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی، اس کا جواب اس توجیہہ میں نہیں ہے، پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جز و پروٹین۔۔۔۔۔ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہہ ہے، جب کہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہا سنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامٹے ڈونوائے (LE COMTE DU NOUY) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لیے جس وقت، جس مقدار مادہ اور جس پنہائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے، اس کے لیے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی 82/10 سال نور (دس کے آگے 82 صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو، یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہنچ جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے، وہ اس عمل کے لیے قطعاً ناکافی ہے، پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سوٹریلین حرکت فی سیکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے، اور اس سارے عمل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے وہ 243/10 (دس کے آگے 243 صفر) بلین سال ہے، مگر ''ہمیں بھولنا نہیں چاہئے'' ڈونوائے لکھتا ہے ''کہ زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی''۔

HUMAN DESTINY, P.30-36)

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطوبہ پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے ناکافی ہے، مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کر لی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے، جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا، اس وقت زمین سورج کی طرح ایک مجسم شعلہ تھی جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی اس انجمادی کے بعد یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے، ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (RADIO ACTIVE ELEMENTS) کی دریافت سے ہوا ہے، تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں، اور اسی لئے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں، اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے، اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یورینیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی ہم تبدیلی کی اسی رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں، یورینیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں، اور بلاشبہ وہ اس وقت چٹان کا جزو ہیں، جبکہ یہ چٹان منجمد ہوئی یورینیم کے ساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورینیم کے ساتھ پایا جاتا ہے، وہ یورینیم کے انتشار (DISINTEGRATION OF URANIUM) سے وجود میں آیا ہے، کیونکہ یورینیم سے بنا ہوا سیسہ، عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے، اس لئے سیسہ کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورینیم سے بنا ہے یا نہیں، اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورینیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے، اور چونکہ یورینیم چٹان میں اس وقت سے ہے، جب کہ وہ چٹان منجمد ہوئی، اس لئے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجمادی کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں، یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹان ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو، مگر ارضیاتی مشاہدہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ جے، ڈبلیو، این، سولیون نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے، اب ظاہر ہے کہ جب صرف ایک غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے سنکھ مہا سنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آگئیں اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے، اور پھر انہیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیا سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق اتفاقاً کیسے وجود میں آگئی جب کہ نظریہ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے، ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ماہر ریاضی پاچو (PATAU) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے، اس سے اندازہ کیجئے کہ اگر محض ارتقاء کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جد امجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہے، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی کریڈر (MARTIN BROKS KREIDER) کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں۔

"THE MATHEMATICAL PROBABILITY OF A CHANCE OCCURENCE OF ALL THE NECESSARY FACTORS IN THE RIGHT PROPORTION IS ALMOST NIL."

(THE EVIDENCE OF GOD;P.67.)

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہوجانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کی لغویت واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے،

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''اتفاق'' سے نہ کوئی ایٹم یا مالے کیول وجود میں آسکتا ہے، اور نہ وہ ذہن پیدا ہوسکتا ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے، یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے، بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ ایسی ہی لغو بات ہے، جیسے کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہوسکتا ہے، ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لئے فرش، کشش ارضی، پانی اور گلاس کہاں سے وجود میں آگئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (HAECKEL) نے کہا تھا'' مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنادوں گا''۔ مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لئے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کررہا ہے، بہت خوب کہا ہے ماریسن نے:

''ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین اور خود زندگی کے مسئلہ کو نظر انداز کردیا، انسان کو وجود میں لانے کے لئے اس کو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہوگا، اور اس کو زندگی دینی ہوگی، پھر بھی اس اتفاقی تخلیق کا امکان کروروں میں ایک کا ہے، اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہوجائے تو اس کو وہ اتفاق (ACCIDENT) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (INTELLIGENCE) کا ایک نتیجہ قرار دے گا''۔

(MAN DOES NOT STAND ALONE, P.87.)

اس بحث کو ایک امریکی عالم طبیعات جارج ارل ڈیوس (EARL DAWIS) کے الفاظ پر ختم کروں گا۔

''اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کرسکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کرلیں گے، لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالمِ مادی کی تخلیق کی ہے، اور اس عالم کا وہ خود کوئی جز نہیں، بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے''۔

(THE EVIDENCE OF GOD, P.71.)

جلد 8 شمارہ 4 جولائی 2006ء جمادی الثانی 1427ھ



عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاح آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 80

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ